ملکوں ملکوں
شہروں شہروں
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company
سحاب قزلباش

ملکوں ملکوں، شہروں شہروں

سحاب قزلباش

دانیال

ترتیب

زینب، محمد اور سکینہ کے نام

دیباچہ

اک اک تارا سانس چلے گا۔ بنجارہ پھرے نگر نگر گائے جائے ڈگر ڈگر۔ دیوندر ستیارتھی آج بڑی شدت سے یاد آئے۔ آل انڈیا ریڈیو کے میوزک سیکشن میں اپنی کالی داڑھی کالی زلفیں بکھیرے صبح ہی صبح آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ نگر نگر کی پوتھیاں جمع کر رہے تھے۔ پہلی دفعہ مجھ کو معلوم ہوا کے سفرنامے بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ بی بی رانی میں پوتھیاں جمع کر رہا ہوں۔ پہلے دن نگر نگر کے گیت بناؤں گا، پھر ان کے بھیتر کے حالات لکھوں گا۔ بنارس کی صبح کے بارے میں ہمارے سب لیکھکوں نے لکھا ہے۔ میں نے مہینوں رات شام کے تارے اچھلتے ہوئے دیکھے ہیں۔ سورج کو لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے بادلوں میں دیکھا تھا۔ یہ میرے گیت بتائیں گے ان کا دکھ۔ کاشی جی کے نہانے کا سمے میں نے رات کو ہوتے دیکھا ہے۔ میرے نگر نگر پھرتے ہوئے پیروں کے دکھ لکھے اور وہ ورق الٹنے لگے۔ سنانے کے لیے۔ میں ڈر جاتی اگر انہوں نے سنانا شروع کیا تو دوپہر کے ریکارڈ الماریوں سے نہ ڈھونڈ سکوں گی۔ اپنی پسند کے مجھے اسکرپٹ بنانا ہوتا تھا ریکارڈوں سے۔ ضرور ستیارتھی صاحب کل سنوں گی۔ ابھی بہت جلدی ہے۔ وقت نہیں۔ آج جب خود پوتھیاں کھول کر بیٹھی ہوں تو ستیارتھی صاحب یاد آئے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ بھی سنیں سب سنیں۔ تھوڑا وقت دیجیے۔ میں نے دنیا دیکھی ہے دُور دُور سے۔ اپنے گھر

اپنی زندگی کو لپیٹے ہوئے علیحدہ نہیں ہوئی اپنے دکھوں سے اس لیے بہت کم دنیا کا حسن دیکھا اس میں۔ نہ صبح بنارس ہے۔ نہ کھٹمنڈو کی شام۔ اس میں ہر جگہ میں نے اپنے گھر کی بساط بچھائی اور بیٹھ گئی۔ کچھ دنوں مہینوں کے لیے روٹی، کپڑا بند۔ جہاں جہاں وقت کی قیمت پیسے سے ملی میں نے گزار دیا وقت۔ باقی دامن جھاڑ کھڑی ہوگی۔ ہر شہر ہر ملک میں روٹی، کپڑا، مکان چھپا ہوا ملا۔

رزق کمانے کے یہی طریقے مجھے نصیب ہوئے۔ ایران کے تین سال نائیجیریا کے کچھ سال پھر لندن سے ہر سال اسکول کی چھٹیوں میں نائجیریا ایک ڈیڑھ مہینے کے لیے باپ کے پاس نبیل کا جانا۔ مجھے بھی جانا پڑا اور ہوٹل میں ہم ایک مہینہ گزار کر آ جاتے واپس لندن۔ ویسے تو میں نے ہندوستان کے بہت سے سفر کیے۔ مشاعروں کی وجہ سے دو دو دفعہ حیدر آباد دکن تک گئی۔ بمبئی، پونہ، احمد آباد، دلی، لکھنو، کانپور، ڈھاکہ، چٹا گانگ، انبالہ، پانی پت، چندی گڑھ، شملہ، میسور، مراد آباد، کافی جگہ۔ پھر پاکستان میں تقریباً سب جگہ، لندن کے سارے سبرب کونٹری تک، امریکہ، کینیڈا کے ۱۸ شہروں میں Caligary تک گئی ہوں۔ مگر ایران، نائیجیریا اور پیرس پر میں نے لکھا ہے ابھی مصر دیکھنے کا جو شوق تھا بچپن میں Book of Knowledge میں ابلہول کی تصویر دیکھا کرتی تھی۔ اتفاقیہ ہی جہاز مل گیا۔ میں بیمار ہوگئی اور مصر اترنا پڑا۔ چونکہ بیمار تھی بہت کم دیکھا۔ دیوبند کے طالب علم لڑکوں کو بہت یاد رکھوں گی سنا ہے وہ اظہر یونیورسٹی میں معلم ہوگئے تھے۔ چار پانچ نوجوان لڑکے ایک کمرہ ہوٹل پھر میں رات کو ان کے کمرے میں ڈر کے مارے آ گئی۔ وہ بے چارے تو نہ سوئے ہوں گے۔ مگر میں آرام سے نیند آنے کے بعد خوب صبح تک سوئی۔ ان سے معافی مانگتی ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ لوگ تو رات بھر نہ سوئے ہوں گے۔ یہی ایڈونچر تو ان کے لیے رات لائی ہوگی۔ بہت سی باتیں مختلف ملکوں کی یادوں میں لپٹی ہوئی ہیں۔ حادثات۔ پھر کبھی زندگی رہی اور قلم نے ساتھ دیا تو ضرور لکھوں گی۔ نہ جانے یہ سفرنامے ہیں یا روزمرہ کے حالات کی جھلک جو لکھ دیا، رکھ دیا۔ کئی مہینوں کے بعد دیکھا تو نقل کر دیا۔ ایران افسوس کے تہران چھٹی میں صرف پانچ دن سید محمد جعفری کے گھر ٹھہر کر گزار دیے۔ وہ تو اپنی دنیا خود لے کر چلتے تھے مجھے کیا سیر کراتے۔ ہنساتے ہنساتے پسلیاں

دکھ جاتی علم کی روشنی میں آنکھیں خیرہ کیے ان کے ساتھ چلتی پھرتی تھی۔ شوکت تھانوی اور سید محمد جعفری کے ساتھ میرے بہت سے دن گزرے راتیں ٹرین کے ڈبوں میں۔ ہچکولے کھاتے ڈبوں میں لاہور سے دلی، کراچی اور ہندوستان اکثر۔ ادیب سہارنپوری، ظریف جبلپوری، حمایت علی شاعر، شوکت تھانوی، سید جعفری، زہرہ نگاہ ان کی نانی ہم سب ایک خاندان کے فرد لگتے تھے کچھ دنوں میں۔ کاش ان کی باتیں ریکارڈ کر لی ہوتیں۔ مزاح و ادب کی گفتگو۔ اشاروں کناہوں میں شعروں کا انتخاب، ریزہ ریزہ میں نے بٹورا ان کی صحبتوں سے جہاں علم ہی علم تھا جلاء و روشنی روشنی۔ اگر زندگی میں روشنی رہی تو کبھی لکھوں گی ان پر۔

سفر

زہرہ اسماعیل نے مجھے اپنے میاں سے کہہ کر محمدی شپنگ کے جہاز میں اتنا اچھا اتنا بڑا کمرہ ڈیک کے پاس دلوا دیا۔ کل چھ سو روپے چارج کیے۔ واجبی سے تھے کل ایک ہزار روپے میں لندن تک۔ اتنی محبت۔ زہرہ کا بہت ہی بڑا دل ہے۔ ہر وقت ہنستی رہتی ذرا برابر مغرور نہیں۔ جہاز اب بمبئی جا رہا ہے پھر عدن، مصر۔ مصر میں لڑائی ہے آج کل۔ مگر یہودی بہت سے بمبئی سے سوار ہوں گے اور عدن کے لیے گجراتی میمن وغیرہ بہت سے پسنجر ملیں گے جہاز پر میں ان کی مدد کروں گی۔ بمبئی میں۔ نام پتے وغیرہ میں لکھوں گی۔ عملے کے ساتھ ملا دیا تھا، کیپٹن سے خاص طور پر زہرہ ملا گئی تھی۔ یہ میری خاص دوست ہے خیال رکھنا۔ وہ انگریزی ہی زیادہ بولتی تھی۔ اگر ذرا دبلی ہوتی تو حسین عورتوں میں گنی جاتی۔ یہ میں نے اُسے کبھی نہیں بتایا۔ تاجی اور زہرہ کو جنون کی حد تک کپڑے بنانے کا شوق تھا اور ہیر ڈریسر کی دوکان پر آدھا وقت گزرتا تھا۔ میں اکثر و بیشتر ان کے ساتھ جاتی اور سوائے مشاہدے کے کچھ نہ سیکھ پائی ان کی صحبت سے۔ جتنی چادر اس کے حساب سے میں رہتی اس لیے زہرہ نے کرائے میں یہ رعایت میاں سے پوچھ کر کی۔ میرا گزارہ ہونا مشکل تھا۔ یہ بات مجھے معلوم تھی۔ علاج کے لیے میں نے سوچا زہرہ کے جہاز لندن آتے جاتے رہتے ہیں۔ میں اگر عملے کا ہاتھ بٹا دوں تو بہت ہی کم

کرایہ ہو جائے گا اور زہرہ نے اسماعیل بھائی سے کہہ کر میرا یہ کام کروا دیا۔ بقول زہرہ تاجی کے
ہماری رونق تو تم ہو جو جا رہی ہو۔ جلدی واپس آنے کی کرنا پتے وغیرہ نوٹ کر لیے تھے۔
دوسرا جہاز یہاں سے کب چلے گا اس میں تمہاری سیٹ ہو گی تم اس میں واپس آ جانا لکھنا
جب تمہارا علاج ختم ہو جائے تو، دیکھو بی بی سی میں نوکری نہ کرنا۔ ابھی وہ دونوں مجھے مسلسل سمجھا
رہی تھیں اور میں ان دیکھی زمین و آسمان کا سوچ رہی تھی۔ دل ڈر رہا تھا۔ سات سمندر پار
جا رہی ہوں لندن اپنا علاج کرواؤں گی۔ پھر زندگی کی دیرینہ خواہش بی بی سی سے اگر براڈ
کاسٹ نہیں کیا تو کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ میری آخری خواہش تھی۔ بڑے بڑے خوبصورت بولنے
والے یہاں سے صاحب تحصیل ہو کر گئے ہیں۔ سب سے پہلا میرا ہیرو۔ آغا اشرف۔ جن کی
بہت سی براڈ کاسٹ میں نے ان کی بیوی صلویا کے ساتھ بیٹھ کر سنیں ہیں۔ موتیا کے پھول کانوں
میں بالیوں میں پروئے ہوئے۔ ململ کے چنے ہوئے ڈوپٹے میں آدھے کھلے آدھے ڈھکے
خوشبوں سے موعتر رنگین رُخ زیبا۔ میں نے اپنے لڑکپن اور جوانی میں دو تین چہرے دیکھے جو
میں کبھی نہیں بھولوں گی۔ صلویا بھابی آغا اشرف کی بیوی، زہرہ آپا، بیگم شوکت اللہ انصاری، جن
میں نمک ہی نمک بھرا ہوا تھا۔ نمکین چہرے جاذب نظر ملاحت بھرے۔ ایسی عورتوں کی ساری
چھب حسن کا نکھار ایسے ہی سنگھار سے اُبھرتے تھے۔ مہندی لگے ہاتھ، چوٹیوں، جوڑے میں
موتیا موگرے کے پھولوں سے سر کے بال سجے ہوئے۔ جسم کے پور پور سے ایک طرح کی خوشبو
پھوٹتی تھی اور میں اُن پر نثار۔ عورت پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا۔

مصر

۱۴ دن کھانا نہیں کھایا انجیکشن بازوؤں میں اٹکا رہتا۔ خون تک نکل آتا۔ ڈاکٹر جہاز کا اتنا کمزور دل تھا کے اس کے ہاتھ کی انگلیاں کانپنے لگتی اور ادھر میری جان نکل جاتی کے اب پھر مصیبت آئی۔ زندگی بھر کبھی جہاز پر نہیں بیٹھوں گی۔ عدن میں آدھے دن جہاز ٹھہرا تو زمین کو چومنے کا جی چاہا۔ کتنی دیر تو زمین ہلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جہاز میں سمندر چاروں طرف ایسا پھیلا ہوا تھا جیسے پانی ساری دنیا میں ہے اور جہاز ایک کٹورا ہو۔ عدن بڑا نام سنتے تھے، فلاں شخص عدن گیا کما کر لایا ہے لکھ پتی ہوگیا۔ تو یہ عدن تھا۔ کالے سانولے نیالے رنگوں کے تاجر۔ دوکانوں پر بیٹھے مکھیاں مار رہے تھے یا شاید جہاز کسی ایسے وقت آیا تھا لوگ بہت کم تھے۔ یا سارا شہر مجھے گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ آدھے گھنٹے میں قرار آیا تو آنکھوں میں طاقت واپس آئی۔ دنیا دیکھنے کی تمنا جاگی ورنہ میں تو دنیا سے بیزار ہو چکی تھی۔ سبز، نیلے، ہرے، اُودے رنگوں میں ڈوبی ہوئی سمندر کی تہیں پانی ہی پانی، سیل ہی سیل۔ ٹھنڈک، سورج، بادل، چاند، ستارے، صاف شفاف آسمان جو سمندر کے چاروں طرف بکھرا ہوا ہوتا۔ صرف آسمان اور نیچے پانی ہی پانی۔ غصے میں بھری لہریں اٹھتی اور تھپیڑوں سے اتنے بڑے جہاز کا کچومر نکال دیتی۔ نہ جانے کیسے لوگ سمندر پر زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگیوں میں۔ میرا تو پندرہ دن میں بھرکس نکل گیا۔ کپڑوں، برتنوں سے بھری ہوئی دکانیں۔

زندگی سے خالی سوکھے چہرے جونوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر بھی مسکراہٹ سے خالی۔روزمرہ کا کام ہو جیسے جذبات سے عاری یہ تھا عدن شکر کہ پورا دن مجھے زمین پر بیٹھنا نصیب ہوا۔

شہاب صاحب حشمت بھی مصر میں ہے۔ شہاب صاحب ایمبیسڈر ہیں۔کیپٹن نے تار بھیج دیا تھا کل جواب آتا ہی ہوگا۔ مصر اُتر جاؤں گی۔ پھر وہاں سے ٹکٹ لندن تک کا مجھے مل جائے گا۔ کل کو اب تو پیسے دینے ہی پڑیں گے۔ اب جواب میں چاہے کتنی ہی سوغاتیں ملیں۔ بڑے پیسے بچائے تھے۔ ایک ہزار میں لندن جارہی تھی۔ اب مصر سے لندن کا ٹکٹ خدا جانے کتنے میں آئے۔ میرے تو سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ مجھے راستے میں اُترنا پڑے گا۔ سمندر کا سفر مجھے راس نہیں آیا۔ قے کر کر کے میرا برا حال ہوگیا چکر آنے لگے۔ جی چاہا کہ یہ جہاز کچھ دیر کے لیے رک جائے تو مجھے سانس آئے دل تھا کہ گھبرائے جاتا۔ زندگی عذاب تھی۔ کسی سے بات نہیں کرتی۔ جی چاہتا کوئی میری کیبن میں قدم نہ رکھے۔ ساری خوش مزاجی ختم ہوگئی۔ جہاز کے عملے کے ساتھ مدد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حشمت، اللہ کرے شہاب صاحب سے کہہ دے تو مجھے وہاں جانے کا فائدہ ہوگا۔ ایمبیسی مجھے ایک دو روز ٹھہرائے پھر میں پیرس سے ہوتے ہوئے لندن چلی جاؤں گی۔ٹکٹ آنے پر۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ کل اگر جلدی بھیج دیں تو۔ اللہ کرے ٹیلی گرام کا جواب کیپٹن کے پاس آجائے۔تو مجھے وہ اتار دیں گے۔ نہر سوئز پر ہم لوگوں کی لڑائی ہے۔ بمبئی سے جو یہودی بھرے ہوئے ہیں مصر اتریں گے۔ کچھ لندن کے لیے نہیں۔ مصر ضرور رُکے گا جہاز۔ دیوبند اسلامک مشن کے چار پانچ لڑکے جو عربی کے طالب علم ہیں قاہرہ یونیورسٹی جارہے ہیں۔ وہ بھی ایک گروپ آیا ہوا ہے۔

صبح دس بجے کیپٹن خود آئے میرے کمرے میں۔ شہاب صاحب ایمپلائز ایمبیسڈر مصر کے ہیں۔ مجھے جواب دیا ٹیلی گرام آ گیا مجھے آج دوپہر نہر سوئز پر اُتار دیں گے دل کو سکون، روح کو آرام آ گیا!!! زمین پر قدم رکھوں گی۔

ایک بڑے سے پہاڑ کو جب کاٹا گیا ہوگا تو یہ creek نکلی ہوگی دو پہاڑیوں کے بیچ کر دور سے دیکھو تو جہاز چھوٹی چھوٹی کشتیاں لگ رہے تھے جیسے کوئی پینٹنگ ہو۔ سارا عملہ جہاز کا کپتان سارا جہاز اُمنڈ آیا۔ سب باہر کھڑے تھے عرشے پر نہر سوئز سے ہم آہستہ آہستہ گزر رہے

ہیں سنا ہے یہاں پر لڑائی ہوئی ہے۔ یہ لڑائیاں بھی عجیب ہیں۔ کسی چیز پر پہاڑ کو کاٹا تو پانی بھر گیا۔ بیچ میں اُس میں سے جہاز جانے لگے۔ شارٹ کٹ ہو جیسے۔ یہ سب دماغ والے لوگوں کی باتیں اور میرا دماغ تو ماؤف ہو چکا ہے۔ ساری دُنیا گھومتی ہوئی لگ رہی ہے۔ حضرت موسیٰ نے طور پر جو خدا سے باتیں کی تھیں وہ یہیں قریب ہی جگہ تھی۔ ہم سب اُسی عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ پہاڑیاں ہی پہاڑیاں پانی کی گود میں تیر رہی تھیں۔ یہ سمندر جس کا پانی کتنے رنگ بدل رہا ہے۔ سورج کی شعاعوں میں منٹ منٹ میں رنگ بدلتا ہے۔ چلو اب میں مصر بھی دیکھ لوں گی مسلسل آٹھ دن سے کچھ کھانا نہیں کھا سکی تے کرتے کرتے نڈھال ہوگئی ہوں نہ جانے اب کیا ہوگا۔ ڈاکٹر کو انٹرونیس انجکشن لگانے میں بڑی قباحت تھی میں خود ڈر گئی تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کے آج مصر میں اُتر جاؤں گی۔ پاکستان ایمبیسی میرا ٹھہرنے کا انتظام کرے گی اور کراچی سے ہوائی جہاز کا ٹکٹ آجائے گا تو میں لندن چلی جاؤں گی۔ سوچا کیا تھا کیا ہوگیا۔ شکر ہے میں بہت دور ہوں ڈانٹ کا خوف ذرا سہا دیتا ہے۔ ایک ہزار کا ٹکٹ پانی کے جہاز کا ختم ہوا۔ جو اتنا سستا تھا زہرہ اسماعیل کی وجہ مجھے نصیب ہوا تھا۔ سنا ہے قاہرہ یونیورسٹی کے لیے چھ لڑکے دیوبند سے سوار ہوئے تھے وہ بھی میرے ساتھ کشتی میں جائیں گے قاہرہ۔ پتلے دبلے زرد رنگوں کے لڑکے جن کی داڑھیاں بے ترتیبی سے اُگ رہی ہیں چہروں پر۔

چاروں پانچوں لڑکے ایسا لگتا جیسے گھر سے اُٹھ کر چل کھڑے ہوئے۔ کشتی میں سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان کا بھی پہلا سفر تھا۔ جیسے پہلی دفعہ سب نے گھر چھوڑا تھا۔ ہر آہٹ سے چوکنا سے، کشتی میں ٹین کے پھولدار صندوق رکھے دونوں بستر رسی سے باندھے جیسے دلی سے شاہدرے کے سفر کو نکلے ہوں۔ ان کے ساتھ مجھے بھی رہنا ہے۔ ہوٹل میں سب مجھ سے چھوٹے تھے۔ ابھی ابھی جیسے دنیا پہ قدم رکھا ہو۔ چاروں طرف سانولے عبا پہنے سروں پر کپڑے باندھے ملاح عربی میں باتیں کر رہے تھے۔ کچھ چھوٹے جہاز کشتیاں چاروں طرف سے سمندر کی نالی میں پڑی تیر رہی تھی۔ سیڑھیوں سے جو لوہے کی تھی اُتر تو گئی ہاتھ پیروں میں طاقت بالکل نہیں تھی۔ پھر سمندر کی لہروں کے جھکولے سیڑھی تک کو ہلا دیتے تھے۔ گیارہ بارہ کا وقت تھا۔ دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ آنکھیں خیرہ تھیں۔ میں نے اپنا سارا سامان جہاز پر چھوڑ دیا

تھا۔ صرف ایک دو جوڑے ایک بیگ میں کچھ کاغذات وغیرہ اپنا پاسپورٹ ساتھ لیا۔ کچھ دن بعد جہاز آ جائے گا اور میں اپنا بکس لے لوں گی۔ جہاز پر کوئی پائلٹ قسم کے کوئی صاحب تھے۔ وہ لندن کے پتے پر بھجوا دیں گے۔ کمپنی والے۔ وہ سب پانی کے جہاز کی چیزیں تھیں بھاری بھاری۔ اس لیے کیپٹن نے مجھ پر رحم کیا۔ رات بھر کا انتظام ہوٹل میں کمپنی والوں ہی نے کیا تھا۔ چلو اچھا ہوا ہم سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے جائیں گے۔ لڑکے اظہر یونیورسٹی میں اور میں پاکستان ایمبیسی کے حوالے۔ اب دیکھیے کیا سلوک ہوتا ہے۔ میرا نام سہاب قزلباش ہے میں نے کشتی میں بیٹھ کر اطمینان کا سانس لیا اور کونے میں بیٹھے پانچوں لڑکوں سے کہا۔ جو اتنی جلدی مجھ سے بے تکلف نہیں ہوئے تھے۔ وہ گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، کہ کون پہل کرے گا۔ اپنا تعارف کرائے یا نہیں۔ یہ جھجک کشتی کے ہچکولوں کے ساتھ بڑھتی گئی۔ ہم سب طالب علم ہیں دیوبند سے سند لے کر آ رہے ہیں عربی زبان میں۔ ایک لڑکے نے جو شاید گروپ کا انچارج تھا، ہچکچاتے ہوئے کہا۔ مگر ان کی عربی تو ہمارے بالکل ہی پلے نہیں پڑی صاحب۔ وہ بھاری طرز سے بول رہے تھے۔ پھر خود ہی مسکرائے۔ یہ عربی تو بالکل ہی مختلف ہے۔ ہم نے ایسی عربی نہیں پڑھی کوئی تو لفظ پلے پڑے۔ دوسرے نے جلدی سے ٹکرا دیا۔ بھلا اب کیا ہوئے گا۔ اتنی دیر ان ملاحوں کی گفتگو پر دھیان ہے۔ یہ تو بڑا ہی ظلم ہوا۔ یعنی قرآن کی عربی بھی نہیں۔

یہی فرماوت ہیں آپ صاحب یعنی ناگرامران کی سدھی۔ گردانوں میں بھی نہیں آوت ہیں بھیا! کیا عربی مختلف بھی ہوتی ہے؟

جی ہاں۔ ان کا تو کوئی لفظ ہی سمجھ میں نہیں آوت ہمرے۔ جب سے کان لگائے رہن کچھ نہیں سمجھ آوا۔

اور میں نے سوچا کہ ان کے اور میرے کمرے ضرور الگ الگ ہوں گے پھر بھی۔ یہ ہیں تو اپنے ہی ملک کے خیال تو رکھیں گے میرا۔

یہاں کے رات کے گیارہ بج گئے۔ کھڑکی کے پردوں کے پیچھے جب سے دیکھا ہے بھلا بتاؤ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ہوٹل کی نہ جانے کون سی منزل ہے سارا شہر روشنیوں میں بہہ رہا ہے اور کھڑکی کے نیچے کی طرف دور تک لوہے کے تار لگے ہیں جن پر چڑھ کر آرام سے کوئی آ سکتا

ہے۔ جب بھی پردہ ہلتا تھا میں ڈر جاتی کہ منہ میں خنجر دبائے کوئی عرب میرے کمرے میں آ جائے گا چھرا لیے ہوئے۔ Arabian Nights کی طرح سارے ڈرامے باری باری میں تنہائی میں دہراتی رہی۔ اور ڈرتی رہی اب کیا کروں گی۔ ڈر لگ رہا ہے کسی کو بتا بھی نہیں سکتی۔ شرم آتی تھی۔ لڑکوں کے کمرے میں بھی ابھی تک روشنی تھی۔ کیا کروں اگر میں لڑکوں سے بات کروں تو کیسے شرم کی بات ہے۔ باہرا کیلی ملک سے جا رہی ہیں اور ڈر رہی ہیں۔ گیارہ سے بارہ بج گئے۔ بڑی بے چین ہوں کیسے رات گزرے گی۔ سامنے والی کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہوں تو زندگی واپس آ جاتی ہے۔ ٹھنڈی ہوا۔ گول گول مصری ٹوپیوں کی طرح کٹے ہوئے درخت۔ مدہم روشنیوں اور قمقموں سے سجا ہوا یہ شہر۔ لمبی چوڑی سڑکیں۔ ہزاروں کاروں کے چلتے ہوئے کارواں کو گود میں لیے مسکرا رہی ہیں۔ ایسے گول گول سر پر ٹوپیاں پہنے درخت میں نے کہیں نہیں دیکھے۔ خوبصورت چہرے خوبصورت عورتیں حسن ہی حسن ہے اس شہر میں۔ صبح سے رات تک میں سڑکوں دکانوں پر دیکھتی چلی آ رہی ہوں۔ صرف کالے کالے مصر کے آدمی کچھ زیادہ کالے ہیں۔ بے عورتیں تو بغیر چادر کے انگریزی لباس میں ملبوس نظر آتی ہیں۔ کچھ اسکارف اوڑھے ہوئے۔ مصری خواتین پھلوں کی دکانوں پر نظر آ رہی تھیں۔ پھل اور سبزیاں بھی اتنی تازی اور شگفتہ جیسے تازہ سُرخ پھول عورتوں کے چہروں پر بہار بن کے کھل گئے۔ بڑے حسین شگفتہ چہرے۔ ہم سب ان کے سامنے زرد زرد مردہ سے لگتے۔ یہاں کے کچھ مردوں کے کالے چہرے ایسے لگتے جیسے ممی جیتی جاگتی پھر رہی ہوں۔ روٹیاں سائیکل پر ایک لڑکا لے کر جا رہا تھا۔ بانس کی چھتری پر لمبی لمبی سفید تندور کی آٹھ نو روٹیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ بات بھی نئی لگی مجھے۔ ہمارے ہاں دسترخوان میں لپٹی آتی ہیں۔ یہاں بازار میں چھتری پر سجائے بیچتے پھرتے ہیں۔ عجیب انوکھی چیز لگی مجھے۔ تماشا کب تک دیکھتی رہتی۔ آخر آدھی رات ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا ذرا سا حال پوچھ آتی ہوں۔ ساتھ آئے ہیں۔ وہ بھی کیا سوچیں گے۔ تھوڑا سا جھجکی مگر ڈر کے مارے رہا بھی نہیں گیا اور دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ وہ سب چپ ہو گئے اور روشنی بجھا دی۔ کچھ میں نہیں آیا کہ یہ کیوں کیا۔ میں نے آواز دی کہ میں ہوں آپ کے ساتھ جہاز پر تھی۔ صرف یہ پوچھ رہی ہوں کہ...... اور جھٹ سے دروازہ کھل گیا وہ سب ڈرے ہوئے تھے میرا خیال درست

تھا۔ میری جان میں جان آئی۔ آپ لوگوں نے روشنی کیوں بند کر دی تھی؟

میں نے ایک دفعہ ہی بم پھینکا۔ آپ سب لوگ یا تو میرے کمرے میں چلیں ایک دو لڑکے یا مجھے یہاں سونے دیں میں اکیلی اپنے کمرے میں ڈرتی ہوں اور وہ سب سہم گئے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ کے کمرے میں ہم یا پھر ہمارے کمرے میں آپ کچھ جھجک سی بھی سنائی دی۔ میں نہیں جانتی یہ عربوں کا ملک ہے میں اکیلے کمرے میں ڈرتی ہوں۔ کچھ دیر بعد میں شرمندہ سوچ رہی تھی۔ یہ سب کیسے ہوگا کہ ہلکی سی آواز سنائی دی۔ محترمہ اگر آپ ڈرتی ہیں۔تو ہم ایسے ہی باتیں کرتے ہیں۔ کوئی بھی سوئے گا نہیں ایک دو کے قریب تو ہے ہی ابھی صبح ہوجاتی ہے۔ پھر آپ اپنے کمرے میں چلی جایئے گا۔

جی ہاں جی ہاں کمرے سے آوازیں آنا شروع ہوئی اور میں کرسی پر اپنا ڈوپٹہ لپٹ کر آدھی بیٹھی آدھی لیٹی سونے لگی۔ ضرور ضرور آپ سب باتیں کیجیے۔ اور میں سونے کی تیاری کررہی تھی۔ کھسر پھسر ہوتی رہی اور میں عربوں کے غول خنجروں سے آراستہ دیکھتی دیکھتی کب تک سوئی۔ صبح جب کسی برتن گرنے کی آواز نے جگایا تو معلوم ہوا کہ میں کرسی پر چار پانچ لڑکوں کی موجودگی میں رات بھر سوئی رہی۔ کروٹ تک نہ بدلی۔ ان کی سُرخ سُرخ آنکھوں سے میں نگاہیں نہیں ملا رہی تھی۔ شکریہ بہت بہت کہتے ہوئے اپنا کمرہ کھولا اور میں پھر سے سوگئی۔ کیوں کہ اب نہ زمین ہل رہی تھی۔ ہم سب زمین پر تھے۔ ایمبیسی کے ایک صاحب دروازے پر تھے۔حشمت کا پیغام تھا۔" یہ صاحب تمہارا ایک ہفتے کا انتظام کر دیں گے۔ میں آج ہی بنگال جارہی ہوں۔تمہاری حشمت"۔

مصر میں میوزیم نہ انسان دیکھے یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ ہم سارا دن نکل جاتے اور شام کو تھکی آتی۔ آج ریڈیو میں ریکارڈنگ کرکے آئی۔ " مجھے مصر کیسا لگا" پیسے ابھی نہیں ملے۔ افسوس میں الاظہر یونیورسٹی نہیں جاسکی۔ وقت ہی نہیں ملا۔ ممی اور ابوالہول دیکھے۔اونٹوں پر بیٹھے۔ مثالیں ساری عمر سنیں تھیں۔ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ آج محسوس ہوا جب میں اس کی پیٹھ پر تھی۔ ہلا جلا کے اُس نے ذرا کے دم نکالا تھا کہ اب گری کہ اب گری۔ کبھی اس طرف کبھی اس طرف۔ کیا کیا چیخوں کو روکا ہے۔ ہزاروں سال پہلے کی ممیز کو دیکھا تو رنگ اڑ

گیا۔ کیسی کافور کی بو تھی ہر طرف یا نہ جانے کس چیز کی جیسے موت کا بسیرا تھا اس جگہ۔ نہ جانے کس کو پکڑ کر ختم کر دے۔ سخت ٹھنڈ اور باہر گرمی۔ ابولہول کا مجسمہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی میرے ذہن میں ایک بہت اونچا سا مجسمہ تھا کہ نیچے کھڑے ہو کر دیکھوں گی۔ مگر وہ تو ایک لمبے قد کے برابر کا مجسمہ تھا۔ ہونٹ غائب ہو چکے تھے۔ جیسے ایک بڑے سے پہاڑ کو کاٹ کر کسی نے جلدی جلدی ابولہول کو جنم دے ڈالا۔ مصر کی شام رات پیرس کی طرح روشنیوں سے جگمگاتی رہتی ہیں۔ قالینوں، پھلوں، کپڑوں کا شہر۔ عربین نائٹ، دمشق، ایران، مصر۔ روشنیوں سے ان کے بازار چمکتے۔ بڑے بڑے دروں سے گزرتے جاؤ اور سونے کے زیورات زرق برق لباسوں سے آراستہ نظر آتے ہیں۔ شاداب چہرے۔ خوبصورت سبز سے باغات میں گھرے ہوئے۔ یہ مصر، دمشق، عراق کے بازار ایک طرح کے لگتے ہیں۔ خوبصورت آوازوں سے گلیاں منور۔ لتا، نور جہاں نہ سہی۔ اُمّ کلثوم، عبدالوہاب کی آوازیں جن کے پھیپھڑوں سے نکلتے ہوئے 'ح' کیا خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں۔ عربی کو ح دے کر اُس زبان کا لطف بڑھا دیا۔ کاش میں بھی ح اتنا لمبا کھینچ سکتی۔ قرآن کا حسن اللہ میاں نے قرات سے کیسا حسین بنا دیا کہ سننے والوں کو وجد آجائے۔ مجھے پتہ لگ رہا تھا کہ یہ بھرویں میں بھگوئے ہوئے سروں کی حلاوت ہے۔ مرجاتی ہوں جب یہاں کی اذان سروں میں رچی بسی ہواؤں میں تحلیل ہوتی ہوئی جگر کے پار ہوتی ہے۔ خدا ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔

آج اس خوبصورت شہر کو الوداع۔ اے مصر کے شہزادوں شہزادیوں پھر ملیں گئے اگر خدا لایا۔ آج رات پیرس جا رہی ہوں۔ شمو باجی اور جھبو بھائی کے گھر۔ وہاں سے لندن ایک چمڑے کی چپل نما چیز خریدی بس باقی پیسے بچا لیے ابھی اتنے لمبے سفر پر ہوں۔ پیسے ختم ہو گئے تو پھر کیا ہوگا۔ نہ جانے پیرس میں کیا گزرے کتنا اپنا دل مارنا پڑے گا۔ جتنے پھل کھانے تھے ہوٹل میں کھا لیے۔ دو کانیں ترستی ہوئی نظروں کی نذر۔ میں تھوڑی بہت عورت بھی کیوں ہوں۔ نہ جانے یہ سنگھار کرتی ہوئی عورت کہاں سے آجاتی ہے۔ یہ میں تو نہیں جو خوبصورت چیزیں دیکھ کر راتوں کی نیند حرام کروں۔ اللہ میاں یہ بھی مجھ سے چھین لے ایسی خواہش تو میں اپنے آپ کو اس تکلیف سے بچا لوں۔ پیرس میں دو دن گزارے اور پھر آنکھ کھلی تو میں لندن میں تھی۔

نبیل اور میں

St. Marie Abbot Hospital

کیا تم نے اپریل کے لیے Plan کیا ہے بچہ؟
نہیں تو۔ میں کچھ جواب ہی نہ دے پائی، کیا مطلب؟
ٹیکس سے بچنے کے لیے اپریل میں مناسب ہوتا ہے نا، اور بچہ بھی مہنگا نہیں پڑتا۔

ناپ تول کے ترازو میں اولاد۔ محبت و پیار، ہر چیز اپنی چادر کی لمبائی چوڑائی میں نپ تل کر میاں بیوی کے پیار کا انجام کہیں کونے میں ٹیکس کی جھلک جب بھی مجھے نظر آتی تو میں سوچتی...... تھرمامیٹر ان کے منہ کے بجائے ان کے ذہنوں میں ہر وقت لگا رہتا ہے۔ کاش میں اتنی جذباتی عورت نہ ہوتی......!

اے کاش میں اپنے ملک کے ان شہزادوں کو یہ تصویریں دکھا سکتی جو میں باتھ روم میں ہر روز دیکھتی ہوں، جو اپریل میں بچے پیدا کر کے ٹیکس بچاتی ہیں اور پھر بہار میں فارغ ہوکر پن اپ گرل بن کر کیلنڈروں کی زینت بن جاتی ہیں۔ چاہے بچے کا باپ ہو یا نہ ہو۔ اور ادھر میرے ملک کے شہزادے اندھیرے کمروں میں اپنے دوست احباب کے حلقے میں بیٹھ کر قہقہے لگاتے ہیں اور قدرت کی صناعی پر داد دیتے ہیں۔ کاش وہ بھی کبھی آ کر ان کی روزمرہ زندگی دیکھتے اور سبق حاصل کرتے...... یہاں کی عورتیں اتنی محنت کرتی ہیں۔ بچے پالتی ہیں...... سودا

سلف لا کر کھانا پکاتی ہیں کپڑے دھوتی ہیں۔ استری کرتی ہیں۔ کمروں سے لے کر باتھ روم تک خود اپنے ہاتھ سے صاف کرتی ہیں اور پھر شام کو بن سنور کر ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہوجاتی ہیں۔ چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے۔

اور اپنے جسم و جاں کو کنوارے پن کے غلاف میں لپیٹے رہتی ہیں۔ ہماری طرح نہیں۔ تن من دھن سب ہی وار دیتے ہیں اور اپنی دکان سے غافل ہوجاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی دکان سجانے کی فکر میں رہتی ہیں منت منت میں شکریہ ادا کرتی ہیں...... سڑکوں پر چلتے ہوئے ہاتھوں کی انگلیوں کی انگوٹھیاں ہی بتاسکتی ہیں کہ یہ ابھی ''مس'' ہیں یا ان کی شادی ہوچکی۔

میرے پلنگ کے ساتھ والی صبح ۱۰ بجے سے ہی اپنے چہرے مہرے کو غازے میں لپیٹنا شروع کر رہی ہے۔ اپنے بوائے فرینڈ کے لائے ہوئے پھولوں کو پانی دینا شروع کر دیتی ہے۔ چہرے پر ایک انوکھی مسکراہٹ اکثر آجاتی ہے اور ماں پن بکھر جاتا ہے اور چیخ کر پیٹ پر ہاتھ رکھے ہوئے سب کو متوجہ کرلیتی ہے۔

اور سب عورتیں مائیں بن جاتی ہیں۔ شادی کے بغیر بننے والی چار پانچ مائیں میرے ہی وارڈ میں تھیں۔ ان آٹھ دنوں میں اس نئے انکشاف کی حیرت بھی اب ختم ہوچکی تھی۔ اس ملک میں رسم و رواج کی کوئی قدر نہیں بس محبت کا بول بالا ہے۔ چاہت کا بھاؤ ہے یہ لوگ زندہ رہنا جانتے ہیں۔ اتنے دنوں میں یہ گرم باتھ روم مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔ اپنا بے ڈھنگا سا جسم ڈریسنگ گاؤن میں چھپائے چھپائے پھرنے کی مجھے عادت ہوچکی تھی۔ میں جھوٹ موٹ اپنے آپ کو مصروف رکھتی۔ کبھی تولیہ لینے کو ''کیو'' تک جاتی۔ ان سب کو تو اتنی جلدی ہر چیز میں ہوتی۔ تاکہ باتھ روم میں چلتے پھرتے سرسری لباسوں کے جسم دیکھ سکوں۔ خوشبوؤں سے معطر جسم و جاں۔ ماں بننے کی خواہش میں بھی یہ کیسے کیسے وقت متعین کرتی ہیں۔ نو مہینے کا بچہ پیٹ میں لیے جسم کے خدوخال ٹھیک کرنا نہیں بھولتیں۔ ورزش، روزمرہ کا کام، کیسی چاق و چوبند رہتی ہیں۔ اور ادھر میں روتی بسورتی اپنی تنہائی کا غم لیے لمبے لمبے کھرے لکھتی رہتی ہوں۔

آج گیارہ بجے ہی سے ڈورتھی نے ماؤں والی نئی جین پہن لی۔ کیوں کہ دو بجے ماؤں کے لیے کلاس میں جانا تھا۔ میرے لیے تو ساری چیزیں نئی تھیں نہ جانے کلاس میں کیا پڑھنا

ہوگا۔

کچھ بھی نہیں! ڈورتھی نے میرا خوف چوکلیٹ دیتے ہوئے ختم کیا۔ ایک ربڑ کی گڑیا کو نہلانا ہوگا۔ اس کی نیپی بدلنی سکھائیں گے۔ دودھ بنانا سکھائیں گے اور آپ کے اپنے نپل کو گرم پانی سے دھونا سکھائیں گے کہ ایک ہفتے بعد انہی سے آپ کا بچہ دودھ پئے گا، اور دودھ پلاتے وقت دکھ نہ ہو...... یہ کہتے ہی اس نے باریک سانائی کا پردہ اٹھایا اور میں حیران رہ گئی۔ سرخ سرخ پیاز کی طرح اس کا سینہ جھانک رہا تھا۔ وہ اپنے نپل کو دبا رہی تھی۔ دیکھو مجھے تو ابھی سے دکھ ہونے لگا۔ سوج گئے ہیں۔ اور میں شرماتے ہوئے بھی چہرے پہ معلوماتی تجسس بکھیرتی رہی۔ تم کو ایک لسٹ بھی ملے گی جو بچے کے لیے مفید رہے گی۔ تم کو پچیس پونڈ کا چیک بھی ملے گا۔ پہلے بچے کی پیدائش پر مریم کے لیے ماں کو دیا جاتا ہے۔ تم کو آج جوس کے واؤچر بھی ملیں گے۔ میری اور تمہاری ایک ہی ڈیٹ ہے نا۔ ۲۴ یا ۲۵ تک ہم دونوں کے بچہ ہوگا۔ مجھ کو تو لڑکا چاہیے۔ میں نے اور ''پیٹر'' نے نیلے کپڑے تک خرید لیے ہیں۔ اگر بدقسمتی سے لڑکی ہوئی تو میری ایک دوست مجھے کپڑے دے دے گی۔ اس کی تین تین لڑکیاں ہیں۔ گلابی کپڑے اُسی سے مل جائیں گے۔ میرے بچے کو بھی وہ رکھ لیا کرے گی۔ کیوں کہ میں ماڈل ہوں۔ مجھے اپنا جسم بھی ٹھیک کرنا ہوگا۔ ایکسرسائز کر کے۔ پیٹر بھی ماڈل ہے۔ ہم دونوں نے یہی طے کیا ہے اور آخرکار سات سال کی دوستی کے بعد ٹیکس سے بچنے کے لیے بچہ پیدا کر رہے ہیں۔ پیٹر کو تو بالکل بچے پسند نہیں۔ میں نے اپنے کام سے چار مہینے کی چھٹی لی ہے۔ بغیر تنخواہ کے۔ مجھے پھر سے اپنا جسم واپس لانا ہے اس لیے تو سوئمنگ کرتی رہتی ہوں۔ اور پھر وہ ایک پاؤں پہ گھومتی ہوئی ناچتی ہوئی نو مہینے کا بوجھ اپنی جین میں چھپائے کوریڈور میں کھانے کی ٹرالی کے ساتھ مڑ گئی۔

میرے پلنگ پر کھلے ہوئے میگزین پر وہ نئے نئے کپڑے پہنے ناچ رہی تھی جو ایک ماڈل تھی۔ جو ایک ماں بن رہی تھی۔ اور ادھر میں ساری زندگی کا بوجھ اٹھائے اپنے ملک سے اتنی دور تن تنہا اس ناچتی ہوئی تتلی پہ حیران بیٹھی سوچ رہی ہوں ہم دونوں ایک جیسی عورتیں ہی تو ہیں۔ ڈورتھی کا چہرہ ہمیشہ ہی شگفتہ رہتا ہے۔ رنج وغم جیسے اسے معلوم ہی نہیں۔ سوائے صبح سے شام

تک پیسے گننا اور اپنے بوائے فرینڈ سے دوسرے دن کے لیے پیسے نکلوانا۔ یہی دو کام اس کی زندگی کے لیے بہت اہم ہیں۔

۲۱ تاریخ۔ آج پھر کھڑکی کے باہر اندھیرا ہے۔ سینئر سسٹر ابھی نیلے رنگ کا ایک لفافہ دے گئی۔ کھٹ کھٹ کرتی ایک چینی کی نیلی آنکھوں والی گڑیا جب ڈاک لے کر آتی ہے مجھے دور سے کوریڈور سے آواز آنی شروع ہوجاتی ہے۔ اس کے قدموں کی کھٹ کھٹ کے ساتھ اماں کا چہرہ اس کے براق جیسے اسکارف کے ساتھ مسکراتا ہوا اُداس چلا آتا۔ میری ماں کا خط، میرے بھائیوں کے خط۔ اس کے باپ کا خط سارے ہی خط میز کے خانوں میں بھرے پڑے ہیں...... بہت سے لفظ رات کے اندھیرے میں چمکتے پھرتے ہیں۔ جگنوؤں کی طرح۔ خدا تمھیں اپنے حفظ و امان میں رکھے تم بہت یاد آتی ہو...... تمہارے لیے سب اُداس ہیں تم یہ ہو...... تم وہ ہو......

اور میں اپنے آپ کی پہچان سے لرزاں ہوں۔ قدرت کی تخلیق پہ پشیماں۔ اَن دیکھے راستوں کے انتظار میں خوف زدہ۔ تن تنہا مجھ کو ہی گزرنا ہوگا۔ جیسے تنہا سب ہی آخرت کے راستے پہ خاموشی سے چلتے جاتے ہیں۔ کیا میں اُن اندھیروں سے واپس آؤں گی؟ یہی سوچتے سوچتے گھبرا جاتی ہوں۔ پچھلی دفعہ جب بے ہوش ہوئی تھی کیسے ٹھنڈے اندھیرے تہہ خانوں سے گزر کر آئی تھی سفید کوٹ میں جھکا ہوا میرا مسیحا اگر مجھے اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے روشنی نہ دکھا رہا ہوتا تو میں تو اسی ٹھنڈے اندھیروں میں کھوجاتی۔ ٹھنڈ سے میرے دانت بج رہے تھے۔ مجھے کمبل دے دو میں کانپ رہی تھی۔ امتحان میں، میں صرف اکیلی تھی۔ اس وقت کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ کتنی بڑی سزا۔ کتنے دکھ۔ کتنی تکلیفیں عورت ہی کو اٹھانی پڑتی ہیں۔ وہ عورت جسے پھول کی پنکھڑی بھی کہتے ہیں وہ عورت جسے حسن کی دیوی بھی کہتے ہیں۔ ایک ذرا سے خواب دیکھنے پر یہ ماں بننے کی عظمت سونپ کر کھڑے ہوجاتے ہیں لوگ۔ اور بے وقوف عورت اپنے تاج و تخت لیے۔ اپنے جسم کے ایک ایک حصے کو چرواتی رہتی ہے۔ کٹواتی رہتی ہے۔ ڈھیروں ڈاکٹروں کی پلٹن جب اس کی نمائش کر کے جاتی تو وہ اپنے آپ پر نفرت کے لبادے ڈال دیتی ہے۔ عورت کتنی مجبور ہے۔ ایسی پشیماں تو وہ کبھی بھی نظر نہ آئی۔ ڈاکٹروں کے ہاتھوں مجبور میاں

کے ہاتھوں مجبور اور پھر اپنے محبوب خدا کے ہاتھوں مجبور یہ مجبوری ہی عورت ہے اور میں ایک مجبور عورت جس سے مجھے نفرت ہے۔ اب مجھے پتہ لگا میری ماں اتنی دور بیٹھی میرے لیے کیوں روتی ہے۔

میری ماں نے مجھ جیسے چار بچے پیدا کیے۔ کیا وہ بھی اتنی تکلیفیں اٹھا چکی ہوں گی۔ جو کبھی منہ پر نہ لائیں۔ کتنی عظیم ہے میری ماں کبھی کبھی تو مجھے اپنے ماں بننے سے نفرت ہوجاتی ہے۔ مجھے ماں نہیں بننا چاہیے تھا مجھے بیوی بھی نہیں بننا چاہیے تھا۔ چاہے جانے کی تمنا۔ مجھے چاہو۔ مجھے پیار کرو۔ ماں باپ کو اپنے بچوں سے اتنا پیار نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ساری عمر ترستے رہتے ہیں۔ ہمیں چاہو۔ ہمیں پیار کرو۔ اس کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں۔ میں آج بہت اُداس ہوں۔ کھڑکی کے باہر آسمان بھی ایسا اداس ہے۔ ڈورتھی کی میز پر رکھے ہوئے پیلے گلابوں نے میری تائید میں گردنیں جھکا دیں۔ تم ٹھیک کہتی ہو مادام ...... یہاں کے گلاب کیسے خوب صورت کیسے تازہ کیسے حسین مگر ان میں خوشبو نہیں ہوتی۔ مگر میرے ملک کے گلابوں میں کتنی خوشبو ہوتی ہے۔ مجھے لارنس گارڈن یاد آ گیا۔

لارنس گارڈن کے ڈور سے گزرو تو کیسے مہک آتی تھی اور لارنس گارڈن کے ساتھ ہی وہ یاد آ گیا۔ وہ خرگوش کے دانتوں والا جیسا قہقہے لگاتا۔ جیسے اسے بھی کوئی غم نہ تھا۔ ڈورتھی کی طرح۔ ایک ہمارے ہاں کے لوگ زندگیاں ہی گزار دیتے ہیں۔ ڈر اور سہم، رسم ورواج، اقدار کی منزلوں کو ناپنے تولنے میں لگے رہتے ہیں اور زندگی خاموشی سے اپنا راستہ طے کرلیتی ہے۔ پھر پچھتاووں کے، شکایتوں کے پھول سجائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ادھر ان لوگوں کا طریقہ زندگی کیسا سہل۔ میری پڑوسن ڈورتھی کی طرح۔ جس نے ایک ایک لمحہ چاہت میں گزارا اور اگر ان دونوں پہ اتنا ٹیکس نہ لگتا تو یہ اپریل میں سات سال کے بعد بھی بچہ نہ پیدا کرتے۔ وہ تو زندگی میں اتنی بھرپور ہے اُسے جو چیز اچھی لگتی ہے وہ چن لیتی ہے۔ اس کی فہرست میں نا اُمید نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ اس کی زندگی میں نہ فردا ہے۔ نہ یادوں کی باراتیں سجا رکھی ہیں۔ وہ تو وقت کی بات کرتی ہے۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے لیے قیمتی ہے اور وہ اُسے ضائع نہیں کرتی۔

کھانے کی ٹرالی آ گئی۔ کھانا بانٹنے کے لیے کیرالین آج بھی نپی تلی مسکراہٹ لیے آئی۔ باہر ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں اور میں خط پڑھنے کے بعد بھی رونا چاہتے ہوئے بھی نہ روسکی۔

اماں کے ہاتھ کا کھانا کیسے کھاؤں؟ ابھی ابھی ابلی ہوئی گوبھی اور آلو ویسے ہی پلیٹ میں ڈال کر بھیج دیئے۔ اماں کے ہاتھ کی گرم گرم چپاتیاں اور شب دیگ اور کوفتے مجھے یاد آئے۔ کیسے پیار سے ہم کھاتے تھے۔ اماں پکاتی جاتی تھیں۔ کیسا اچھا بچپن تھا۔ ہم کیوں بڑے ہوگئے۔ وہ ہندوستان تھا۔ یہ لفافہ پاکستان کا ہے مجھے یہ لوگ انڈین کہتے ہیں اور میں کہہ کہہ کر تھک جاتی ہوں...... میں پاکستانی ہوں۔ میں پاکستانی ہوں۔

"Its the same thing" وارڈ کی عورتیں ہمیشہ ہی کہہ دیا کرتیں۔ اس ملک میں آ کر کیسی نئی نئی راہیں کھلی ہیں۔ یہاں کے رسالے اور میگزین پڑھ پڑھ کر یہاں کی زندگی سمجھنے میں ذہن میں کتنی راہیں کھل گئیں...... سوچ کے طریقے بدلے۔ جذبات پہ قابو پانا، چہرے سے مسکراتے رہنا۔ کیسا مشکل اور اپنے آپ کو ایک نئے طرز زندگی میں داخل کرنا۔ اب تو میرے پاس صرف وطن کی سوچ ہے جس سے تمازت ملتی رہتی ہے ورنہ یہاں کی ٹھنڈ نے تو دل میں سوراخ تک کر دیئے۔ سارے اچھے پیارے لوگ، جن سے محبت کی لو جلتی تھی۔ بس اس شہر آلود آسمان کے پیچھے چھپ گئے۔ اماں میں کیسے بتاؤں کہ میں آپ کو کتنا یاد کرتی ہوں۔ آپ بھی عورت ہیں آپ نے بھی چار بچے پیدا کیے ہیں۔ بقول ڈاکٹر کے میں تین چار دن کے بعد ماں بن جاؤں گی۔ مجھے عورت پن سے نفرت ہوگئی تھی۔ بڑی مغرور تھی کہ عورت تخلیق کرتی ہے۔ آج کیسی اپاہج بنی بیٹھی ہوں، یہ کام بھی خلاق کے ہاتھ میں ہے۔ آج شام کو چار بجے پھر ڈاکٹروں کی ٹیم آئے گی۔ مجھے لیبر روم لے جائیں گے آج پھر ٹیسٹ ہوگا اور درجنوں نامحرم کھڑے ہوں گے اور میری نمائش ہو رہی ہوگی اور میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں...... مگر میرے جسم کے چاروں طرف آنکھیں کھلی رہتی ہیں...... کوئی نہیں سمجھ سکتا میں کیسی بدلتی جا رہی ہوں:

وہ مسکرائی...... ہیلو...... پھر میاں کو خط لکھ رہی ہو۔ میرے جواب کے انتظار سے پہلے اس نے میرے منہ میں تھرما میٹر ٹھونس دیا۔ اس نو مہینے میں پیار کے تصور کو سجا کر، چھپا کر اپنے

ہونٹوں کو کبھی کبھی اکیلے میں وہ شدت وہ گرمی بخش دیتی تھی جو تھرمامیٹر اپنی ٹھنڈک سے سارے جسم کو یخ کردیتا۔ نہ جانے جب تھرمامیٹر لگتا ہے تو میرے پیٹ میں موومنٹ کیوں شروع ہوجاتی ہے اور وہ ان دیکھا اجنبی بھی میری خوشی اور رنج کا شریک ہوجاتا۔ نہ جانے وہ کتنی پیاری ہوگی یا ہوگا۔ کاش پیارا خوب صورت اپولو کی طرح کا ہو۔ نورمل، وہ مسکرائی۔ اسی مسکراہٹ سے جو سب نرسوں نے طے کرکے اپنے چہرے پر سجا رکھی تھی،اس سے زیادہ نہ مسکرانا اور صرف چند سیکنڈ رکھنا چاہیے۔ نرسوں کی اس نپی تلی محبت سے وہ اب تک عاجز آچکی تھی۔ ایک ہی طرح کی مشینی کل پرزوں سے چلنے والی چینی گڑیائیں...... تھینک یو، تھینک یو، کرتے صبح شام گزر جاتیں...... لندن کی اس ٹھنڈک سے اس کے سارے جذبات منجمد ہوتے جارہے تھے۔

آج میں بہت اُداس ہوں کیونکہ کل مجھے لیبر روم پہنچادیں گے۔ بقول ڈاکٹر ابھی دس دن باقی ہیں اور میں چل بھی نہیں سکتی آسانی سے۔

آج مجھے پھر اسپتال میں داخل کرلیا۔ آج میری گھبراہٹ سچ میں شروع ہوگئی۔ پورے اسپتال میں پورے شہر میں میرا کوئی نہیں۔ کل شام جب میں بازار سے واپس آئی تو سارا جسم برف کی طرح ٹھنڈا اور مردہ تھا۔ اب تو پیروں کا درد بھی ٹھنڈک میں تحلیل ہوتا جارہا ہے...... پیر سوج گئے ہیں۔ چپلیں پیروں میں گھس گئیں...... مجھے امی بے اختیار یاد آگئیں۔ اوپر کے فلیٹ سے مٹر آلو کے پکنے کی خوشبو آرہی تھی اور اس سردی میں مجھے پاکستان کی وہ رات یاد آئی جب امی جلدی جلدی میرے لیے گرم گرم روٹی پکاتی جاتی تھیں اور ہم سب، بہن بھائی کیسے شرط لگا لگا کر آلو مٹر کا سالن کھارہے تھے۔ ہرے دھنیے کی پتیاں شوربے کی سطح پر کیسے تیر رہی تھیں۔

آنکھ بند کرکے میں نے بھی ایک نوالہ کھایا...... مزا آگیا...... ہائے اللہ امی سے کہو...... کسی کے ہاتھ ہوائی جہاز میں آلو کا سالن، بیسنی روٹی، آم کا اچار بھیج دیں اور ہرے دھنیے کی چٹنی......

اچھا اچھا میرا منہ کڑوا ہونے لگا اور وہ نرس ہوا میں تھرمامیٹر ہلاتی ہوئی آرہی ہے۔ ابھی کڑوی دوا سے دھوئے گی۔ اس کی چمکیلی نظروں نے مجھے بتا دیا ہے۔ خط تم ختم کرو باقی پھر لکھو، اگر اخبار والی آگئی تو جلدی پوسٹ کردے گی۔ دیکھو ادھر ہماری گورنمنٹ اور اُدھر تمہاری

گورنمنٹ کو کتنا فائدہ ہو رہا ہے ٹکٹ بیچنے کا، ہر روز ایک خط لکھنے کا۔ کل تک زندہ رہے تو پھر لکھیں گے۔ میرے گھر کو پیار کرنا، در و دیوار کا پودوں کا خیال رکھنا۔ لو وہ آ گئی۔ خدا حافظ۔ اس کے دانت بہت اچھے ہیں نیگرو جو ہے۔ شاید بہت صحت مند دانتوں کی چمک ایسی ہی ہوتی ہے۔

تم جلدی سے نہالو۔ ویٹنگ روم میں تمہیں شفٹ کر دیں گے آج۔ کل سے تم صرف بیڈ پر رہو گی۔

نمبر فائیو میں چلی جانا۔ وہ اپنی باتوں کی تیزی اپنی جوتیوں کی کھٹ کھٹ میں ملاتی ہوئی نظروں سے غائب ہوگئی اور میں سنسان ذہن سے عقل و سمجھ کی روشنی ڈھونڈتی ہوئی بغیر سوچے تو لیا لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔

ہائے...... ہیلو...... اوہ مسز! اور نہ جانے کس کس نے مجھے مخاطب کیا باریک قہقہوں میں جن کی باریکی نائیلون کی نائیٹیز کی باریکی کو مات کر رہی تھیں۔ میں نل کی ٹونٹی ہاتھوں میں پکڑے گنگ کھڑی تھی سامنے کی لائن میں جہاں سفید پیازی جسم حباب سے پھریری لباس میں باتوں قہقہوں کی ہر تحرک پر کتنی خوبصورتی سے لرز جاتے تھے۔ حسن کے مجسمے، زندگی میرے بڑے قریب تھی اور آج ایک مہینے بعد اسپتال میں میں بھی ان جیسی ہی تھی۔ مجھے یاد آیا جب میں خود ڈاکٹر کے سامنے گئی تھی تو کتنا روئی تھی۔ مرد ڈاکٹر مجھے ہاتھ لگا رہا تھا اور آج یہاں میرے سامنے باتھ روم میں کتنی ایسی حسین جسموں والیاں اپنے حسن سے لاپرواہ میدہ شہاب جسموں کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو میری نگاہیں دوبارہ نہ اٹھ پائیں۔ پھر کئی دنوں بعد نظریں چرا کر کچھ عورتوں کو باتوں میں لگا کر دور جسموں کو کیسی جلدی جلدی میں نے دیکھا تھا۔ پھر سارا دن جیسے فلم دیکھتی رہی اور آج تو اتنے قریب سے دیکھ رہی ہوں۔ مجھے سمجھنے میں آسانی ہو رہی ہے۔ زندہ عریاں ماڈل دن رات ہی بکھرے رہتے ہیں اس غسل خانے میں۔

اپنے ملک میں جسموں کی لمبائی چوڑائی، قمیضوں، شلواروں، ساڑھیوں کی بھول بھلیوں میں کھوئی رہتی ہیں۔ جو بھی قریب آئے محسوس ہوتا ہے مگر ان میں رنگوں کی سجاوٹ، جسم کا حسین گداز، میرا جسم، میری آنکھیں سب ایک دم سے اسیر ہوگئیں۔ کتنے مجسمے میں نے چن چن کے اپنے پاس سنبھال کر رکھے ہیں، بڑی ہمت سے۔ کوئی دیکھ تو نہیں رہا کہ میں کتنے غور سے دیکھ

رہی ہوں۔ کتنے زندہ، صحت مند جسم، صراحی دار گردنوں کے قریب سنہری، کالی بھیگی لٹیں، ان میں سے ٹپکتے پانی کے قطروں کو سنبھالے جسم۔ کتنی مونالیزائیں مسکراتی رہیں۔ جب پانی کے باریک لباس پہنتی رہیں اتارتی رہیں۔ حسین ٹانگوں کے اوپر چھوٹے بڑے پیاز کے چھلکوں سے منڈھے ہوئے چھوٹے بڑے مٹکے نما پیٹ، نیلی رگوں کے جال میں جھولا جھولتے آنے والے ننھے منے بچوں کی مائیں خوشبودار صابن کی جھاگوں کی اوڑھنی اوڑھتی رہیں۔ دھوتی رہیں۔ مانجھتی رہیں۔ سب کی سب کتنی خوش ہیں یہاں کی عورتیں۔ دنیا کے سفر سے میں دو تین دن میں ہی تھک گئی۔ نمبر ۶ کا کل جو بچہ پیدا ہوا اور ڈورتھی کے ہاں پرسوں لڑکی پیدا ہوئی۔ ان کی ننھی ننھی خوب صورت انگلیاں مجھے یاد ہیں۔ ڈورتھی جو کہ سات سال بعد ٹیکس بچانے کے لیے بچہ پیدا کرنے آئی تھی۔ وہ پہلے دن تو اتنا شرمائی، اپنی بچی کو پوری طرح دیکھ بھی نہ پائی اور میرے جسم میں جو ایک وجود ہے۔ جسم میں، کمر میں، پیٹ میں، چاروں طرف پھیلا ہوا ایک درد، جو چاروں طرف گھوم رہا ہے۔ ایک کانپتی ہوئی ٹیس دس دس منٹ بعد زندہ ہو جاتی ہے اور میں پھر اپنے وجود میں واپس آجاتی ہوں۔ اے اللہ! میری مدد کر، کتنا بڑا دکھ ہے۔ اپنی زندگی کی تازگی، اپنا خون، اپنا دماغ نہ دل، سب کچھ چُرا کر جو میرا جسم تخلیق کر رہا ہے ایک اور جسم کو — یہ اس کا شاہکار ہوگا جو سرمئی آسمان میں چھپا بیٹھا ہے یا جو میرے ملک میں اپنی تختی پر نام لکھوانے گیا ہوا ہے یا میں اس کی ماں جو لیبر روم میں لیبر میں ہوں۔ کیسے میرے جسم کے ایک ایک جوڑ میں اب گرمی پھیلتی جا رہی ہے تھکاوٹ میں بھی درد کتنا میٹھا ہو گیا ہے۔ میرے جسم، میرے پیٹ میں سوائے اس چھوٹے چھوٹے نرم ہاتھ پیروں کے جو کبھی کبھی ایک KICK کرنے پر میری ممتا کو میرے سامنے لاکھڑا کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو میں رو دیتی ہوں۔ تنہا کیسے یہ سب کچھ جھیلوں گی اور اگر میں مرگئی تو ایک لال کمبل میں لپیٹ کے اسٹریچر پر ڈال کر ایک ٹھنڈے تہہ خانے میں ایک ٹھنڈی الماری میں بند کر دیں گے۔ جب تک پاکستان میں لاش بھیجی جائے۔ اب پھر مجھے سردی لگنے لگی۔ موت کا خیال، موت کی ٹھنڈک، لاؤ میں Will لکھ ہی دوں۔ میری لاش کو بھی، یہیں دفن کر دیں۔ مجھے کسی کی فاتحہ بھی نہیں چاہیے۔ میں اپنی صورت بھی کسی کو دکھانا نہیں چاہتی۔ یہاں کے قبرستان بھی کتنے خوب صورت ہوتے ہیں صاف ستھرے پھولوں سے ڈھکی قبریں۔

مجھ سے اب کچھ نہیں لکھا جا رہا۔

آج کی صبح پھر ننھی منی بوندوں سے شروع ہوئی۔ صبح کی سینئر سسٹر مجھے ایک اور نیلا لفافہ دے گئی۔ چائے پینے کو سخت دل چاہ رہا ہے۔ صبح سات بجے ٹی ٹرالی آئے گی۔ مگر اسپتال کا قائدہ ہے کہ لیبر روم میں جانے سے پہلے نہاؤ۔ انیما لینا ہے۔ گرم پانی سے اس وقت نہانا ہے اور میں اس انتظار میں کہ کیا کیا بہاریں ہیں اس خواب کے پیچھے۔ اور میں اللہ میاں سے کچھ اور دعا مانگ لوں۔ اے کاش میں اس وقت اکیلی نہ ہوتی۔ کوئی تو کاش اس وقت ہوتا۔ مسز چوہدری بھی نہیں۔ مسز چوہدری صبح دس بجے تک آئیں گی۔ ان کے دعا پڑھنے سے ایسا سکون ملتا ہے کہ جیسے میں سچ مچ بچ جاؤں گی۔

دماغ نے سوچنا چھوڑ دیا۔ میری تکلیف، میرا دکھ بانٹنے والا کوئی تو ہوتا...... مسز ایشلے کے نیچرل پینس شروع ہوگئے ہیں۔ صبح سے وہ اپنے پلنگ کے چکر کاٹ رہی ہیں۔ جب اپنا درد ضبط کرتی ہے تو سفید مری ہوئی مرغی سے ایک دم سرخی میں بدل جاتی ہے۔ مگر عورت چاہے چین کی ہو یا یورپ کی یا پاکستان کی ماں بنتے وقت سب کو ایک ہی طرح کا کرب جھیلنا پڑتا ہے۔ اپنے آپ کو کاٹ کر ایک اور تخلیق کرنے کا درد۔ ڈورتھی کیسی پتلی پتلی باریک ایڑیوں پر گھومنے والی ڈورتھی۔ جب اپنے پیٹ پر Stitches لگوا کر آئی، بچی کو سینے سے لگاتے ہی اسی طرح ہنسنا شروع کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ عورت کبھی کبھی تو بالکل گائے بھینسوں کی طرح لگتی ہے جو گھاس میں بچہ پیدا کرتے ہی بھائیں بھائیں کرتی ہے چاہے رونا ہو یا خوشی کا ہنسنا، کتنی جلدی اپنا غم بھول جاتی ہے۔

لندن کی اس کھڑکی کے باہر سڑکوں پر، گھروں کی صحنوں میں، گلیوں میں گھاس کے خطوں پر یہ سیاہ کھڑے چھوٹے بڑے درخت بانجھ ہیں جو اندھیرے کہرے میں لمبی ویران بانہیں پھیلائے اُداسی کی سوگواری کا ماتم کر رہے ہیں اور ادھر ڈورتھی نے چپکے سے چھوٹے ننھے سے ریڈیو میں ''ارتھا کٹ''۔ ''بیلے فاؤنٹینے''۔ ''نٹ کنگ کول'' کے گانے بجانے لگی ہے۔ شاید آواز کا حسن ہے جو میرے درد کا وقفہ ذرا دیر سے شروع ہونے لگا۔ ابھی بہت دیر ہے کیونکہ مجھے سینئر سسٹر نے بتایا تھا کہ جب کبھی دس دس منٹ کا وقفہ ہو تمہارے پیٹ کے درد میں تو یہ لال

رنگ کا بٹن دبا دینا۔

امّی..... امّی..... میں اتنا روئی کہ آنسو میرے منہ پر بہہ رہے تھے اور میری آنکھ کھل گئی۔ امّی کا خیال..... اتنے قریب امّی کو دیکھ کر اپنے آپ کو سیکڑوں میل، ہزاروں میل دور، سات سمندر پار سینٹ میری ایبٹ ہوسپٹل میں سفید براق سے بستر پر اکیلی پڑی سو رہی تھی۔ شیشے کے باہر اسی طرح بارش مسلسل ہو رہی ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ صبح ہے یا شام ہے اور میں کتنی دیر سوئی۔ مگر اماں میرے پاس ابھی ہو کر گئیں۔ یہ مجھے نرسوں کی صورت بھی مدہم سی نظر آ رہی ہے کچھ یاد نہیں آ رہا۔ امی کی شکل یاد ہے۔ ان کی وہی نیلی رنگ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ امی نے دعائیں دیں تھیں۔ مجھ پر پڑھ کر پھونکا تھا۔ اُف مجھے کتنی سردی لگ رہی ہے۔ سردی سے میرے دانت بج رہے ہیں۔ لیبر روم کے دروازے کے سامنے میری میز پر بڑا سا ایک روشنی کا طباق لٹک رہا تھا۔ ''دوسو'' پھول لائی تھی جو گلدستے میں لگا دیئے گئے ہیں۔ میری نرس نے کان کے پاس پیار سے کہا تھا۔ ڈونٹ وری..... گھبراؤ نہیں۔ گھبراؤ نہیں..... ڈاکٹر ابھی دیکھ کر گیا ہے۔ ابھی پھر آئے گا۔ تمہیں دو انجکشن لگے ہیں۔ اب تم سو جاؤ گی آرام سے۔ بے بی آنے ہی والا ہے اور اس دکھ اور آنے والے خوف سے، وہ بے بی مجھے سچ مچ زہر لگا اور میں ابکائیاں لیتی ہوئی اندھیری سیڑھیوں سے نیچے تہہ خانے میں اترتی گئی۔ میرے منہ پر نرس نے جلدی سے کالی ٹوپی اوڑھا دی جو ٹھنڈی ٹھنڈی ملیٹھیوں اور برف کے کرچوں سے بھری ہوئی تھی۔ میرا سانس بند ہونے لگا مگر مجھے اس میں سانس لینا تھا۔ اسی اندھیروں میں ٹکرا رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کوئی ٹھنڈی ہوا کی کھڑکی کھول دے۔ کہیں سے کوئی تازہ ہوا لا دے اور پیٹ کے اندر ایک طوفان دکھ کا۔ تکلیف کا، درد کا ایک طوفان اٹھتا چلا آ رہا تھا جو اور نیچے چاقو سے جیسے کوئی کاٹ رہا ہو اور میں جیسے خون میں بہتی چلی جا رہی تھی:

نہ جانے کونسی تاریخ ہے..... ۲۵ اپریل کو نبیل پیدا ہوا..... بھائی صاحب کا ٹیلیگرام تو ملا ہی ہے۔

کھڑکی کے باہر بوندیں شیشے پر ٹکرا ٹکرا کر نیچے کی طرف پانی جا رہا تھا وہاں پر گلاب سایہ دار لگ رہے تھے۔ ۱۰۳ بخار کیوں ہوا۔ ننھے ننھے چہرے کوئس میں سے نکلے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میرے پورے جسم میں ٹھنڈک سے جھٹکے لگ رہے تھے۔ انجکشن لگ رہے تھے انفکیشن ہوگیا۔ کیوں ہوا؟ میرا سنہری فریم والا ڈاکٹر لڑکوں لڑکیوں سے پوچھ رہا تھا جو اپنی اپنی فائلوں پر نہ جانے کیا لکھ رہے تھے۔ ہائی Forcep تھا اب نارمل ہے Very good اور پوری ٹیم مسکراتی ہوئی میری جان چھوڑ گئی۔ مجھے پسینہ آ رہا تھا مجھے گھر یاد آ رہا تھا اس اسپتال کے باہر لندن تھا سات سمندر پار کہاں جاسکتی ہو تم اور میرا جی چاہا چپکے سے بھاگ جاؤں ابھی ابھی اُسی بخار میں اپنی ماں کے پاس، بھائیوں کے پاس۔ وہ سب کیسے بے قرار تھے۔ پہلی دفعہ میری ماں پاکستان میں ہسپتال کے برآمدے میں صرف نماز اور دعا ہی کرتی رہی۔ تین دن تک ہمارے بھابھی بھائی چپ چاپ کھڑے رہے اور میں نہ چھپاتے ہوئے بھی چیخ رہی تھی۔ تو یہ عورت کتنی سخت جان ہوتی ہے۔ مجھے اپنے عورت ہونے پر نفرت ہوگئی۔ اور آج میں تنہا تھی۔ کبھی ہوش میں کبھی بخار کی غنودگی میں بے ہوش اور خاموش ماحول۔ ماں میرے پاس تھی اور مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی۔ کیوں پھر سے یہ کام کیا۔ بچہ کا تحفہ ضروری تھا۔ اگر مر جاتی تو کیا کیا مصیبتیں پیش آتی۔ پھر اس آدمی کا بچہ پیدا کیا جو نہ مجھے چاہتا ہے نہ ذمہ داری اس کو پیاری لگی۔ صدا سے بھاگنے کی عادت دوسروں پر نظریں رکھنا۔ قناعت کہاں۔ ایسی بے وقوف عورت۔

بی بی سی، بش ہاؤس

تو یہ تھا میرا آخری خواب۔ بخاری صاحب کا خط میں نے بڑی مشکل سے ڈین صاحب کو دیا۔ اُردو سیکشن کے یہ تھے انچارج اس زمانے میں۔ مجھے یقین تھا کے مجھے آج ہی نوکری مل جائے گی۔ خط پڑھتے ہی ڈین صاحب نے بڑے خشک انداز میں کہا کل آپ آئیں آپ کا ٹیسٹ ہوگا وائس کا۔ پھر سوچیں گے کہ کہاں فٹ کریں، بخاری صاحب کیسے ہیں؟ اور میں نے جلدی جلدی حساب لگایا کہ میرے پاس کتنے پیسے رہ گئے۔ کتنے دن کا خرچ باقی ہے۔ کمرے کا کرایہ، پھر کیسے گزر ہوگا۔ بڑا دُکھ ہوا مجھے معلوم تھا ایسا خشک لہجہ کس وقت ہوگا۔ بہت لوگوں کے انٹرویو جو دیکھے تھے۔ میرا جی چاہا کے ڈین صاحب سے کہوں آپ مجھے پروگرام دیں یا نہ دیں ایک بار اسٹوڈیوز تو دیکھ لینے دیں۔ کیسی بے چین تھی میں اس وقت کہ میرے پڑوسی ناظم آباد سے، ریحانہ کے شوہر، وقار صاحب اسٹوڈیو کا دروازہ کھول کر پسینہ پونچھتے ہوئے باہر آئے۔ نیوز پڑھ کر آرہے تھے۔ ہلو سحاب، بھئی تم کب آئیں؟

اور میں کوئی جواب نہ دے سکی صرف بے تکے پن سے ہنستی رہی جس کا نہ کوئی موقع تھا نہ محل۔ مسٹر ڈین، سحاب پاکستان میں بڑی مشہور ہیں۔ بڑی اچھی براڈ کاسٹر ہیں، اور میں خوشی سے پھولی نہیں سمائی۔ مگر خوشی چھپاتی رہی۔ قسمت نے کام دکھا دیا۔ اچھا اچھا بہت خوب، بخاری

صاحب نے بھی یہی لکھا ہے، دیکھتے ہیں دیکھتے ہیں اور وہ روبانوں جیسی اُردو بولتے رہے۔
سحاب کل ریجنٹ اسٹریٹ پر اسٹریا کے اسٹال پر نمائش ہے تم میرے پروگرام کے لیے کورج کر
ڈالو۔ پانچ منٹ کا اسکرپٹ ہو۔ بس وہ دھیمے دھیمے بولتے رہے جو ان کا اپنا اسٹائل تھا۔ بہت
سہج سہج بولنے کا انداز۔ لفظوں کو آہستہ آہستہ استعمال کرتے تھے آخری لفظ تک سنائی دے۔
آئیں میں آپ کو اس کا میٹریل دوں اور ایڈریس بھی۔ اور میں کچھ بھی نہ کہہ پائی...... کہا تو اتنا
کہ مجھے ایک دفعہ اسٹوڈیوز تو دیکھنے دیں...... اچھا تم ابھی تک اندر نہیں گئی چلو چلو...... وہ مجھے
دروازہ کھول کر اندر لے گئے۔ مجھے لگا میں آل انڈیا ریڈیو کے نئے اسٹوڈیوز میں کھڑی
ہوں۔ بالکل ویسے ہی مگر ذرا چھوٹے چھوٹے کمرے۔ بوتھ میں کھڑی میں پروگرام براڈ کاسٹ
ہوتے دیکھ اور سن رہی تھی کے حیرت اور محبت اور انکشاف کے صدمے سے میں کرسی پر دھڑ سے
بیٹھ گئی۔ ارے یہ کب سے مائیک پر الاؤ کیے گئے ہیں۔ یہ تو مائیک پر بین تھے اتنا خراب لہجہ
ان کا، یہ بی بی سی بول رہے ہیں اور میں حیرت سے سلیم شاہد کو دیکھنے لگی جو دلی ریڈیو پر بتیرا
تھے۔ یہ بتیرا صاحب براڈ کاسٹ کر رہے ہیں۔ نہیں بھئی یہ سلیم شاہد ہیں۔ جی جی اور میں
ہکلانے لگی۔ اپنے آپ کو میں نے بدلنا چاہا...... یہ تو دِلّی کے پرانے براڈ کاسٹر ہیں۔
جی جی۔ یہ پروڈیوسر تھے دلّی میں انگلش ٹاک سکشن کے۔ ضرور ضرور اب اس کے بعد جو
بھی بولے مجھے کوئی رنج و غم نہیں ہوگا۔ جب یہ نیوز میں اپنے پنجابی لہجے اور بے تکے جملے بول
سکتے ہیں تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔ تو یہ بی بی سی لندن ہے۔ پھر مجھے کبھی کوئی غم نہ ہوا۔ میں آرام
سے بولتی رہی لکھتی رہی۔ ایکٹنگ کرتی رہی۔ جو مرضی مجھے جو بھی پروڈیوسر بلواتا میں بہ خوشی ادا
کرتی رہی۔ مجھے صرف پیسے چاہیے تھے۔ ایک منٹ کی ایک گنی کے حساب سے میں لیتی رہی اور
بس میری بلا سے کوئی کیسے ہی بولے۔ وقار صاحب اگر مجھے پہلا پروگرام نہ دیتے اور اللہ میاں
میرے لکھنے میں مدد نہ کرتے تو میں بھی اور لوگوں کی طرح ریں ریں کرکے پروگرام کرتی۔ ویسے
بہت سے پروڈیوسر چاہتے تھے کہ ان کی تعریف کروں۔ تو وہ خوش ہوتے۔ یہ بھی مجھے پتہ لگ گیا
تھا۔ ایک خاص معقول رقم مجھے مل جاتی اور میں چپ چاپ کام کرکے چلی آتی۔ مجھے پورے ۹
مہینے کام کرنا تھا پھر اس کے بعد میرے بچے کے باپ کا پروگرام تھا کہ لندن گھر لے کر یہیں

رہوں اور وہ میرے گھر پاکستان میں رہتے رہیں۔ مگر میں ایک بچے کے ساتھ اتنی قلیل آمدنی
میں نہیں رہ سکتی تھی۔ کام بھی کروں بچہ بھی پالوں یہ سب مجھے نہیں معلوم تھا۔ خوبصورت شہر۔ نئی
ایجادوں کے کرشمے، خوبصورت چیزیں، بڑی کشش رکھتی تھیں۔ پر کب تک۔

ہائیڈ پارک

آج تو ڈھیر لگ گیا پروانوں کا۔ سرخ زرد پتوں کا ڈھیر۔ کالے درختوں کی ٹہنیاں بیوہ کی بانہوں کی طرح انتظار میں ہیں۔ میلوں لمبے ہائیڈ پارک سے سپیاجی کے پل کے پاس یعنی نائیٹ برج کے قریب امین صاحب کی گاڑی جب لڑی تو میرا نہ جانے جی کیوں چاہنے لگتا ہے کہ میں چپکے سے گاڑی کا دروازہ کھول کر ہائیڈ پارک میں اُتر جاؤں۔ جہاں ٹھنڈے کورے میں لپٹی ٹھنڈ درختوں کی کالی ٹہنیوں سے پتے گرا رہی تھی۔ سُرخ ملگجے زرد پتے گرتے ہی جا رہے تھے۔ خشک پتوں نے دور تک پھیلے ہوئے لق و دق باغ پر سوکھے پتوں کی چادر بچھا دی۔ اتنے خشک پتوں کے ڈھیر کے آدھے آدھے گھٹنے دھنس جائیں۔ ایسا اُداس سکون جہاں خاموشی میں نیند کی غنودگی ہواؤں میں بکھری ہوئی ہے۔ ٹھنڈ میں دور گھوڑوں پر سوار لوگ سایوں کی طرح درختوں کے ساتھ دھوئیں میں تیر رہے تھے۔ ایسی میٹھی میٹھی خوشبو گیلے پتوں کی ایسا جنونی بنا دیتی کہ کئی دفعہ مجھے بنچ پر بیٹھ کر بھی یاد نہیں رہتا کہ لارنس گارڈن میں بیٹھی سنگترے نہیں کھا رہی۔ یہاں کہیں چمکیلی دھوپ نہیں ہے۔ ہلکی ٹھنڈ میں ڈوبی کھڑی ہوں سپیاجی کے پل کے ساتھ ساتھ کنارے لگے ہائیڈ پارک کے اِس بارڈر پر پہلے ہی دن سے نرنقبہ ہوں۔ اِن میں بہاروں کے اَچھوتے رنگ ہیں۔ اُونچے اُونچے درختوں کی لمبی لمبی قطاروں کی بازوں میں کتنے ہی گرم

سانسوں نے جنم لیا۔ محبت کی آنکھ سے کتنی ہی کونپلیں جھلس گئیں اور سنا ہے کتنے ہی چاند کہہ روں میں ڈوب گئے۔

Keats House

شیشے کی شفاف الماری میں رکھا ہوا ایک اور شیشے کا فریم جس میں ایک بادامی کپڑے پر ننھے منھے لفظوں میں کڑھی ہوئی ایک نظم نظر آئی۔ اس الماری پر عورتوں کا ہی جھمگٹا تھا۔ اس الماری میں ایک پرانے چمڑے کا ننھا سوکھا ہوا چھوٹا سا بٹوا تھا جو انگریز عورتیں ہینڈ بیگ میں رکھ کر چلتی ہیں۔ جسے ہماری زبان میں تلے دانی کہتے ہیں۔ چھوٹی بڑی سوئیاں ناپنے کا فیتہ۔ اس کی عجیب و غریب شکل تھی۔ جو اب ایسی نظر نہیں آتی۔ انگشتانہ جو وقت کے ساتھ سیاہ پڑ گیا تھا۔ چھوٹی بڑی قینچیاں جن کی چمک زنگ نے چھپالی تھی۔ تارکشی کے دھاگوں کے رنگ بدل چکے تھے۔ سب کی نظریں اُس شیشے کے فریم پر لگی ہوئی تھیں۔ بہت سی سرگوشیوں اور عورتوں کے چہروں کے تجسس جس میں حیرت بھی نمایاں تھی۔ میں نے بھی مجبور ہو کر ایک کونے سے شیشے کے فریم پر سے پڑھنا شروع کیا۔

پہلی لائن تھی The lovely young one who had a friend۔ وہ حسینہ جس کا کبھی ایک ہم دم تھا۔ جو اب اِس کمرے میں بیوہ کے ساتھ رہتی ہے۔ یہ کڑھی ہوئی نظم جس کو پیانو پر بجانے کے لیے رکھا گیا تھا، اُس پر سرگم کے نوٹ بھی علیحدہ بڑی خوبصورتی اور صفائی سے لکھے تھے۔ سُرخ گلاب کے پھولوں کی ننھی ننھی کلیوں اور غنچوں سے سجے ہوئے یہ الفاظ۔ ہر لفظ کو اتنی محنت اور محبت اور صفائی سے Fanny Brown نے کاڑھے تھے جن کو یہاں کی خواتین بھی دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔

John Keats کی موت کے دوسال کے بعد انتظار میں Fanny Brown نے یہ پوری نظم کاڑھی ہوگی جو واقعی نادر نمونہ ہے کشیدہ کاری کا۔ کئی ادھورے پھول کڑھے ہوئے رکھے تھے۔ جن میں طبیعت کے اُچاٹ ہونے اور اکتاہٹ کی مداخلت محسوس ہوتی تھی۔ الماری کے دوسرے خانے میں John Keats کی دی ہوئی سرخ یاقوت کی انگوٹھی جو ماں کی نشانی بھی تھی۔ جس کے ہیرے بھی وقت کی گرد میں ماند پڑ گئے تھے۔ وہ انگوٹھی جو منگنی کی رسم تک ہی نبھا سکی۔ Keats کے سنہری بالوں کا ایک گچھا جو لاکٹ میں فینی کے دِل کے قریب رہتا تھا۔ وہ ایمتھیسٹ کا بروچ جو رُوم جانے سے پہلے Keats کو فینی نے دیا تھا۔ جو اس شیشے کی الماری میں رکھے گواہی دے رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی فینی کی تصویر جو Keats کے میز کے پاس رکھی رہتی تھی۔ دبلی پتلی سی سنہری بالوں کی چٹیاں گوندھے اٹھارہ سالہ فینی جو Keats کے کمرے کے باہر ہر باغیچے کی ساجھے دار پڑوسن بھی تھی۔ یہ فینی تھی جس پر اُس نے نظم لکھی اور وہ سارے خطوط جو شیشے کی الماریوں میں اب بھی قرینے سے لگے رکھے ہیں۔ انگلستان کا نوجوان شاعر جو اِس گھر میں رہتا تھا۔ پڑوس میں ہی فینی کا کمرہ ہے۔ وہ ایک کرسی، لکھنے کا چھوٹا سا ڈیسک جن پر بیٹھ کر وہ لکھا کرتا تھا اوراس زمانے کا قلم دان۔

قلم بھی دم توڑ چکا ہے۔ وہ پیانو بھی اُسی طرح محفوظ ہے۔ Keats کے کمرے کے پاس برآمدے کے شیشے اتنے شفاف ہیں۔ جن کے دروازوں سے لپٹی بیل اِس طرح جھول رہی ہے جیسے لائبریری کے شیشے سے چمکتا ہوا سورج اور اداس چاند Keats کی کُرسی پر اُسی طرح نچھاور ہوتا ہے جہاں پر وہ لکھا کرتا تھا۔ دیواروں پر ورڈز ورتھ، شیکسپیئر، ملٹن کی تصویریں اُسی طرح مسکرا رہی تھیں اور باہر گھاس پر رکھی ہوئی وہی بنچ اُسی طرح خاموش نوحہ پڑھ رہی تھی، جس پر بیٹھ کر پام کے درختوں پر بیٹھی ہوئی چڑیا پر نظم لکھی تھی۔

ODE TO A NIGHTINGALE

My heart aches, and a drowsy numbness pains
My sense, as though of hemlock I had drunk,

Or emptied some dull opiate to the drains
One minute past, and Lethe-wards had sunk:
Tis not through envy of thy happy lot,
But being too happy in thine happiness,
That thou, light winged Dryad of the trees,
In some melodious plot
Of beechen green, and shadows number less,
Singest of summer in full throated ease.

گوکہ وہ پام کے درخت اب نہیں رہے۔ آخر درخت بھی کب تک ساتھ دیتے۔ ۱۷۹۵ء سے ۱۸۲۱ء تک اتنے سال ۲۵ سال کی زندگی میں زندگی کی تلخیاں، زندگی کی ناکامیاں، محرومیاں سب کچھ جو اللہ میاں نے دی تھیں وہ سب کتابوں میں لکھی چھوڑ گیا۔ جن کے لفظ ہمیشہ ہی چمکتے رہیں گے۔

کتابوں میں دلوں میں ہمسٹیڈ ہیت کا نام جب بھی آئے گا John Keats فوراً یاد آئے گا۔ وہ گھر اب بھی ہے وہ سرسبز باغ اب بھی باہیں پھیلائے بلاتا ہے۔ وہ درخت کا ٹوٹا تنا نہ سہی اسی طرح کا درخت تنہا گھانس پر لیٹا سانس لے رہا ہے جہاں اب بھی صبح صبح Nightingale آ کر چہچہاتی ہے۔

Charles Brown اور Joseph Severn نے بہت ادب کی خدمت کی ہے۔ اُس کا سہرا براؤن اور Severn کے سر ہے۔ کیوں کہ براؤن نے مالی امداد بھی بہت کی۔ گھر بھی دیا رہنے کو۔ اُن کا گھر جو آج Keats house کہلاتا ہے۔ اور J.Seven نے Keats کے آخری لمحوں تک ساتھ دیا ہے۔ گھوڑے کی سواری میں باپ کا انتقال ہوا۔ Keats کی ماں نے پھیپھڑوں کی بیماری سے انتقال کیا۔ بھائی کا بھی۔ Keats اسکول کے زمانے ہی سے شاعری کرتے تھے۔ ۱۸۱۶ء میں پانچ سال تک جو مشہور ہوئی۔ ۱۸۲۱ء میں پہلا

ٹی بی کا ٹمیسٹ ہوا۔ لندن کے ایک بہت ہی خوبصورت علاقے میں جس کو Hampsted Hill کہتے ہیں اس گھر میں سردی سے نمونیا ہوا پھر بخار رہنے لگا اور دس دسمبر کو خون تھوک میں آنا شروع ہوا۔

Keats نے بڑے خوبصورت خطوط لکھے وہ سب محفوظ ہیں۔ ان شیشوں کی الماریوں میں اور کتابوں کی شکل میں۔ تو مجھے بتانا یہ تھا کہ عورت کسی شکل میں ہو وہ مقامِ راہ بھی بن جاتی ہے کبھی کبھی اور اُس کے جذبہ ایثار و محبت کا تو بڑے بڑے شاعروں اُوتاروں نے ذکر کیا ہے۔ Fanny Brown نے جب تک Keats بیمار رہے بہت خدمت کی۔ ڈاکٹروں کے مشورے سے وہ روم لے گئیں کہ وہ اب کہ لندن کی سردی نہ گزار سکیں گے۔ گرم ملک بھیجا جائے۔

Joseph Severn نے جو بہت بڑے آرٹسٹ تھے اور اُنہوں نے اپنے التفات پر روپے پیسے کو ترجیح نہ دی اور Brown اُن کی خدمت پر معمول رہے۔ اِن دونوں آرٹسٹوں نے Keats کی بے انتہا خدمت کی اور Keats سے انگریزی ادب میں اضافے کروائے۔

کیٹس کے گھر سے تھوڑی دور چارلس ڈکن، بائیرن، ملٹن اور رابندر ناتھ ٹیگور کے گھر ہیں۔ ٹیگور کا گھر اُسی زمانہ کا بہت بڑا گھر ہے۔ ٹیگور کی برسی پر لوکل بنگالی اس رات لان پر بیٹھ کر ان کے نام کی شراب پی لیتے ہیں اور دو ایک ان کے گیت گائے جاتے ہیں۔ اس گھر میں رہنے والی خاتون نے مجھے بتایا تھا۔ ڈیکن اور بائیرن کے چھوٹے سے ٹیرس گھر ہیں۔ آپ جب جائیں لندن تو دیکھنا نہ بھولیے گا اور جب جب آپ Daffodils دیکھیں تو Keats کو ضرور یاد کریں کہ یہ اُس کی آرزو تھی کہ اس کی قبر پر یہ پھول لگائے جائیں۔

ایران

سفر

جاگتے جاگتے ساری رات پھر سے گزاری۔ ''یہ میرے پیسے ہیں۔ انہیں مت ہاتھ لگاؤ۔'' وہ چیختا رہا۔ چاروں طرف بڑے بڑے لفظ چمکتے رہے۔ اندھیرے میں بار بار چمک جاتے یہ لفظ اور میں کروٹیں بدلتی رہی گرم گرم سلاخوں پر۔ ''تم میرے ساتھ نہیں جارہی''۔ ''اس خیال میں بھی نہ رہنا''۔ ''میرا تمہارا گزر نہیں ہوسکتا۔'' وہ انگریزی میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ میری آیا عدے نبیل کی آیا انگریزی نہیں سمجھتی تھی مگر اس کو معلوم تھا آج پھر بیگم پہ صاحب خفا ہو رہا تھا اور بس یہ تو روز ہی ہوتا ہے اکثر و بیشتر وہ نبیل کو لے کر چلی گئی باہر...... روز کی طرح میں بھی تیار ہوکر آفس جارہی ہوں۔ بیزار اور ڈری ڈری سی...... اب نہ جانے کیا ہوگا۔ افریقہ کا سفر۔ نوکری ختم۔ چار سو روپے مہینے کی رقم نبیل کے باپ کا حصہ ختم۔ نبیل پھر باپ کے بغیر۔ اکیلا رہ جائے گا...... ایک گھبراہٹ۔ تنہا ذمہ داری۔ نوکری کیسے کروں گی اکیلی ...... نبیل کے ساتھ......

کچھ عرصہ لندن میں رہنے کے بعد میں دوبارہ پاکستان آگئی تھی لیکن......

تو یہ طے ہے کہ وہ پھر علیحدہ رہے گی۔ وہ اکیلا ہی جائے گا پھر سے اب کے میں اکیلے

ہی نبیل کو پالوں گی۔ پھر سے بغیر مرد کے رہیں گے۔ اللہ میاں نے ایک دن میں کچھ سے کچھ کر دیا۔ آپ کی اسکیم کا جواب نہیں۔ صبح تک نبیل کے والد صاحب اپنی امریکن ایمبیسی کی نوکری چھوڑ کر افریقہ نائیجیریا جا رہے تھے۔ آج شام چار بجے میں ایران کے لیے 6 سال کا کنٹریکٹ سائن کر کے آ گئی۔ آغائے زرنگار ایرانی پروگرام کے پروڈیوسر آغا شاہ پوریان ایرانی سروس کے انچارج نے مجھے اردو سروس چلانے کے لیے 6 سال کا کنٹریکٹ سائن کروالیا۔ میں نے جو کے رات بھر نہیں سوئی تھی غصّے میں، بغیر سوچے سمجھے سب کو بتانے کے لیے اپنی ضد کی تسلی کے لیے سائن کر دیے ۔ میں بھی پاکستان چھوڑ کر ایران چلی جاؤں گی یہ کیا سمجھتا ہے میں کچھ بھی نہیں...... اور میں اپنی فتح پر پھٹی جا رہی تھی۔ کیسے سب کو جلدی سے بتاؤں۔ مجھے صرف ایک ڈر تھا۔ نبیل کیسے گھر میں اکیلا ایران میں رہے گا۔ جب میں اسٹوڈیو میں دفتر میں کام کروں گی وہ کیسے رہے گا۔ ایرانی گورنمنٹ ایک دو نوکر لے جانے کی اجازت دے چکی ہے۔ کسی کو لے جانے کی پابندی نہیں۔ پھر...... پھر سرخوش بھائی پسند نہیں کریں گے۔ بھائی صاحب تو بہت خوش ہونگے وہ بھی خیام، سعدی، حافظ کو بہت چاہتے ہیں۔ مگر سرخوش بھائی کہیں گے نبیل کیسے اکیلا رہے گا۔ اس کو تو وہ اور اماں ہی ایک طرح سے پال رہے ہیں۔ ریڈیو جاتے وقت میں امی کے پاس چھوڑ کر جاتی ہوں۔ اور میں خوشی اور شرمساری میں سارے گھر کی چیزیں اُونے پونے میں بیچ کر ایران جانے کو تیار ہوگئی۔ ایک ہفتے میں شاہ آف ایران زاہدان پہنچ رہے ہیں۔ زاہدان سے ریڈیو سٹیشن زاہدان سے اُردو میں پروگرام شروع ہو رہا ہے۔ آر سی ڈی کے پروگرام کے مطابق۔ اگلے ہفتے پروگرام شروع ہوگا۔ 100 کلوواڈ کا اسٹیشن امریکہ نے تحفتاً دیا ہے۔ 6 سال کا کنٹریکٹ میں نے سائن کر دیا۔ ریڈیو پاکستان سے سحاب قزلباش سب سے سینئر اناؤنسر جا رہی ہیں اردو پروگرام شروع کرنے۔ اور میں اخباروں کی سُرخیاں سسکتی ہوئی ٹرین میں بیٹھی ہوئی پڑھتی رہی۔

چلو یہ نوکنڈی کے بعد زاہدان کی سرحد شروع ہوئی...... وہ مسکرا رہی تھی مگر اندر سے دل ڈوبا جا رہا تھا۔ ظاہراً...... یہ تو بالکل گاؤں ہے سندھ کا ایک دیہات کا ٹکڑا...... زاہدان تو ایران کا حصہ ہے۔ حافظ، سعدی کا شہر خیام کا شہر۔ میں تو ایران جا رہی ہوں...... وہ اپنی ماں کو سمجھا رہی

تھی۔

شام کے اندھیرے میں لمبے لمبے سوکھے سے درخت قطاروں میں آزردگی سے خاموش کھڑے تھے۔ اندھیرے ملگجے سے شام کے اندھیرے میں زاہدان ریل کی سیٹیوں سے خاموشی کو توڑ رہا تھا۔

اکا دُکا بلوچی پھٹی ہوئی بڑے بڑے گھیروں کی شلوار میں بڑی پگڑیوں پر ٹین کے بکس رکھے اِدھر اُدھر جا رہے تھے۔ انجن سستا رہا تھا اور نبیل اپنی نانی جان کی گود میں چین سے سو رہا تھا۔ امی کبھی مجھے کبھی اسٹیشن کو دیکھ رہی تھی۔ زاہدان مدھم سے تختے پر لکھا ہوا منہ چڑا رہا تھا۔ ہمارے لفظ حلق میں خشک ہو گئے تھے۔ امی کی حیرت کا کیا جواب دیتی۔ دو تین بیریکس اُداس بند کھڑکیوں کے ساتھ بغیر روشنی کے۔ مٹی کے غول میں دھندلی ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان خاموش اور گرم ہواؤں کے جھوکے کچوکے دے رہے تھے۔ نہ کوئی آدم نہ کوئی خوش آمدید کی رسم اپنی خوشی سے آئے اپنی خوشی سے جاؤ۔ یہ بے نیاز ایران تھا جو مجھے کیسے کھینچ کے لے آیا۔ شاہ آف ایران یہاں آئیں گے۔ عنایت گل میرا نوکر میری آیا عدے کا لڑکا جو میں صرف نبیل کے لیے لائی تھی پاکستان سے آیا تھا۔ دھول میں لپٹے اپنے ہونٹوں کو کندھے پر پڑے ہوئے رومال سے پوچھ رہا تھا۔ خو بیگم صاحب یہ کیا ایران ہے؟ کیا یہ ایران ہے اماں؟ وہ میری مظلوم اماں سے مخاطب تھا۔ بیگم صاحب آپ کو تو کوئی بھی لینے نہیں آیا اب کدھر جائے گا۔ ہم سب ایک دوسرے سے آخر کہاں تک نظریں چراتے اور ہم سب نے ہنسنا شروع کر دیا۔ ایسے وقت کی بے ساختہ ہنسی کو نہ جانے کیا نام دیتے ہیں۔ جب ہنسی کے بعد آنکھوں میں آنسو بھی آ جائیں۔

ریڈیو اسٹیشن ایران زاہدان کے بورڈ پر ٹیکسی رکی اور جان میں جسم نے حرارت تیزی سے شروع کر دی۔

ریڈیو اسٹیشن کے بالکل پیچھے آپ کا گھر ہے۔ وہاں صبح سے کلفت انتظار میں ہے۔ ...... یہ چابی لیجیے۔

بڑی سی لق و دق انگنائی کے دونوں طرف لمبے برآمدوں سے بڑے اندھیرے کمرے۔ بیچ انگنائی میں مٹی گرد میں ڈوبا فوارہ جو قطرے قطرے پانی کو ترسا ہوا۔ نیلی آنکھوں والی کالی

چھینٹ کی چادر میں سے لپٹی لپٹائی میری نوکرانی یہ ہے زہرہ آپ کی کلفت۔

کیسا اچھا نام فارسی کا حسن، نشہ ملا ہوا واہ۔ کیا تکلیف اور کوفت کا مرکب کلفت۔ اور میں نے خوش ہو کر اماں کو غور سے دیکھا۔

اماں یہاں نوکرانی نہیں کہتے دیکھا۔ کلفت کہتے ہیں اور میں نے خوش ہوکر کہا دیکھا ماں! اور مری ماں کوسوں دور سے اپنے پاکستان سے واپس آ رہی تھی اک آہ کے ساتھ وہ مٹی بھرے فوارے کی منڈھیر پر بیٹھ گئی...... بلوری لیمپ زہرہ جلا کر میرا چہرہ دیکھتی رہی۔ خوش آمدید خانم۔ خوش آمدید باریک سی آواز میں لرزش سی لرزش تھی اور میں تھکی تھکی پلنگ ڈھونڈ رہی تھی۔ سب چیزیں نئی۔ اجنبی زمین آسمان سب خاموشی۔ میرے ساتھ جو لوگ تھے وہی کچھ محبت کی گرمی بکھیر رہے تھے۔ ایرانی پلاؤ کی خوشبو نے اندھیرے سے دالان میں زندگی بخشی۔ چلو کباب۔ من درست کرم بیارام شما بے فرمائند۔ صغرہ درست می کنم اجازہ...... اجازہ...... میرے منہ سے ٹکڑے ٹکڑے گرتے گرتے متشکرم نکلا جو تھوکوں سے ٹکرا کر ہونٹوں سے نکل رہا تھا۔

پھر سے ریل کی سیٹی بجی گرمیاں آ گئی۔ زمستان کے کمروں میں کل سے سامان رکھنا ہے۔ لق و دق آنگن کے دوسری طرف دو بڑے دالان اور پھر کمرے ہیں۔ چھ مہینے سردیوں کے کمرے چھ مہینے گرمیوں کے کمرے آنگن کے اس طرف اور اُس طرف۔ مٹیالی اینٹوں کے بیچ و بیچ بنے ہوئے اس فوارے کے چاروں طرف انار کے چھوٹے چھوٹے پودے ہر گھر میں لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ دِن کو میری کلفت تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہاتھ لگے پمپ سے کنویں سے پانی نکالتی جاتی ہے۔ کلفت یعنی زہرا۔ ایران میں نوکرانی کو کلفت کہتے ہیں۔ کیا اچھا نام ہے۔ تکلیفوں کا مرکب۔ اس دیہات کا حسن صرف فارسی زبان ہے۔ اس دیہات میں تین سال سے بیٹھی میں اپنے آپ کو اُس وقت جوان محسوس کرتی ہوں جب آغائے مہیت اور آغائے روان بخش گلہائے نغمہ پیش کرتے اور جب وہ فارسی کے اشعار پیش کرتے اپنے فارسی کے مخصوص لہجے میں تو فردوسی اور حافظ ایسے ہی پڑھتے ہوں گے۔ ایسی شیریں زبان نرم لہجے والوں کے لیے کیسے سخت سنگین اصول، نیزوں اور برچھیوں کی انی میں ڈوبے ہوئے...... کیا غلطی کی

تھی۔ نہ سمجھا نہ سوچا اور چھ سال کے کنٹریکٹ پر دستخط کر دیئے۔ ایک مہینے کا پروگرام بھی ریکارڈ کرو اور ساتھ میں دو مہینے کی ریکارڈنگ بھی۔ یعنی روز کے 3 پروگرام لکھوں ایک گھنٹے کے اور ریکارڈ بھی کروں ہائے میں تو مرجاؤں گی! بڑی بن رہی تھیں۔ یہ تو ہم سے بھی بدتر ہیں۔ نہ ان کی کوئی لائبریری تھی ریکارڈوں کی۔ 50-60 کے قریب میں ریکارڈ اپنے ساتھ لائی تھی ان کو رجسٹرڈ کیا Ledar Tape لگائے فہرستیں بنائیں جب آئی تھی تو تین چار نوکنڈی قریب کے گاؤں سے آئے ہوئے خطوط تھے۔ اور میرے زاہدان آتے ہی میں نے دن رات ایک کر کے لائبریری بنائی ریکارڈوں کی۔ پروگرام لکھے دو دن کی پیشگی ریکاڈنگ تیار رکھی کے اگر کوئی حادثہ ہوجائے تو فوراً پروگرام کا ٹیپ انجینئر لگا دے ''مہندس'' یعنی انجینئر کو آفیشلی بتا دیا گیا کہ ایمرجنسی میں Tape یہاں سے نکال لے۔ آفس ورک سب فارسی میں ہوتا تھا۔ انگریزی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آفس تمام ایران میں صبح سات بجے سے ایک بجے تک 3 بجے سے سات بجے تک۔ دو گھنٹے گھر پر آ کر کھانا وغیرہ کھا لو بس نہ انسان لیٹ سکتا تھا۔ عجیب حالات تھے۔ پورے گھر میں غسل خانے کا نام نہیں بیت الخلا ضرور ہوتا۔ گھر کے دونوں طرف بڑے بڑے دالان پھر دو دو کمرے۔ گرمیوں میں آپ اپنے لیٹنے کا انتظام کریں سردیوں میں دوسری طرف بیچ آنگن میں فوارے ساتھ کے ہیڈ پمپ ضروری لگا ہوتا۔ انار کے بے شمار چھوٹے بڑے درخت۔ نہانے کے لیے آپ کو قریب کے محلے میں جانا پڑتا حمام میں۔ میرے اسٹیشن ڈائریکٹر کی بیوی نے مجھے پہلے ہفتے ہی مدعو کیا۔ کلفت پیغام لائی بڑی شائستگی سے کہا فارسی میں کے آپ کو ہماری بیگم نے اسی ہفتے جمعہ کو یعنی چھٹی کے دن محلے کے حمام میں مدعو کیا ہے دوپہر کے گیارہ بجے۔ آپ اپنے پہننے کے کپڑے مجھے دیدیں۔ میں وہاں آپ کو دے دوں گی میں حیران پریشان کہ کیا کہوں۔ حمام میں ان کے سامنے کیسے نہاؤں گی۔ اب مثال بھی سمجھ میں آئی۔ ایک حمام میں!۔ سب کہتے تو تھے اس مثال کا صحیح مطلب اب سمجھ میں آیا۔

حمام

حمام کی گرم ہوا میں میرا سانس رک رک کے آنے لگا۔ مدھم روشنیوں میں چھوٹے

چھوٹے کمروں کے پتلے پتلے برآمدوں میں ملتانی میں نہاتے ہوئے جسم۔ ایک عورت دوسری عورت کو جھاؤیں سے کر گھس رہی تھی۔ اپنے پاجامے کے پائنچے چڑھائے، تولیے سے نچلے حصے سے ڈھکے ہوئے، اپنے خانوں سے ایرانی خواتین نے مجھے جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ خانم پاکستانی آمدہ۔ سرگوشیوں میں میری آمد پھیل چکی تھی۔ گرم گرم ہواؤں کے بھبھکے میرے چہرے کو نم کر رہے تھے۔ باہر تیز سورج کی روشنی سے آنکھیں اندھیرے میں کالے سیاہ دھبوں کے علاوہ چہرے جسم کچھ نظر نہیں آرہے تھے کہ خانم فخر نے پذیرائی کی "بے فرمائیں، ازیں طرف"...... "ادھر آئیں میری طرف"۔ آواز کے سہارے میں اُدھر ہی برآمدے میں کلفت کے ساتھ جلدی باہر سے چادر کی مصیبت سہتی آرہی تھی کے اب کپڑے اتارنے شروع کر دیے۔ کلفتیں جھپٹے مار مار کر کپڑے اتارنے کے درپے تھیں۔ میں انڈرویئر پہن کر گئی تھی۔ بنیان بھی زبردستی پہنا تھا۔ بھلا افسر کی بیگم کے سامنے جسم سارا ننگا ہونا تھا۔ ایک غیر جگہ جہاں ہر عورت اپنے اپنے برآمدوں سے جھانک رہی ہو۔ ایسی پریشان تو میں کبھی نہ تھی۔ کہاں پھنس گئی۔ مسکراہٹ بھی مجھ سے خفا تھی۔ زندگی کیسے گزرے گی اس انجانے مہذب ملک میں۔ سر کو اتنا ڈھکنا اور پیروں ٹانگوں میں موزے فراکیں پہنے نیچے سے بالکل انگریزوں کی طرح کے لباس اُوپر چہرے آدھے ڈھکے ہوئے سیاہ چادروں سے یہ کہاں کا دستور ہے۔ عجیب کشمکش ہے اللہ تو مجھے یہاں سے نکال۔ میرے بنیان نے نہلانے والی کو بدمزاج کر دیا۔" خانم جان قربان اینجا۔ تمام خانماں ہستند چرا شما خجالت می کنی۔" آپ اتنی شرم کیوں کر رہی ہیں یہاں سب خواتین ہیں۔ میں قربان جاؤں۔"

میں کیا جواب دیتی۔ صرف یہی کہہ سکی کہ آئندہ ضرور اتار دوں گی اور دل میں طے کیا کے آئندہ کبھی اس حمام میں نہیں آؤں گی چاہے آغائے فخر ہی مجھے بلائیں۔ یہ کیا مذاق ہے۔ میں اپنے باورچی خانے میں اینٹوں کے فرش پر چوکی رکھ کر ہی نہالوں گی۔ دروازہ بند ہوگا صرف پانی ہی نپا تلا ہوگا۔ بس یہ ضرور خرابی ہے۔ پانی میں جیسے تیل ملا ہوتا ہے تو یہ جبھی لوگ اتنے حمام گرم رکھتے ہیں۔ میل تھا کے بتیاں کی بتیاں اتر رہا تھا۔ میں شرمندگی سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔ وہ خود ہی مسکرائی اور فارسی میں مجھے بتایا کے پہلی دفعہ ہے اگر تم بنیان اتار دو تو پھر

دیکھو میرا کمال۔ اتنا میل نکالوں سارے پور کھل جائیں تمہارے جسم کے۔ دنیا کے کتنے مختلف دستور ہیں۔ کتنی پابندیاں ہیں۔

قالینوں سے سجے چھوٹے کمرے میں خانم فخر چائے کی ٹرے لیے بیٹھی تھی۔ ایک عورت ان کے بالوں میں ہیئر ڈرائر سے لہریں ڈال رہی تھی۔ ''زلف خمیدہ'' میری زبان سے نکل گیا۔ باہ باہ خانم فخر نے برجستہ تعریف کی۔ ''بیسار خوب فارسی بلند استند ؤ''۔ اور ہم سب ہنس پڑے۔ پھر انہوں نے کہا کہ جمعہ کو برنامہ کی چھٹی ہوتی ہے۔ آپ مری مہمان ہوں گی ہر جمع کو بارہ ایک تک میں یہاں آتی ہوں۔ یہ میرا اوطاق ہے کوئی اور نہیں آ سکتا اس میں سب سے اچھی بات یہ ہے۔ چائے کے دو استکان میں ختم کر چکی تھی مصری کی ڈلی بھی چائے کی تلخی نہ دور کر سکی تھی۔ ہونٹ اندر سے سکڑ رہے تھے۔

آج بڑا ہی خراب دن تھا، پہلا دن نشریات کا، پچھلے پروگرام آغائے ذکریا نے سنانے چاہے۔ جو وہ تیر مار چکے تھے۔ میں نے کہا میں بالکل نہیں سنوں گی۔ میں اپنے آپ لکھوں گی آپ سنیں جب میں نشر کروں گی۔ یہ بات وہ مسکرا کر سنتے رہے۔ پھر نشر ہونے سے پہلے مجھے آغائے فخر نے بلایا کے آپ مجھ سے ملیں۔ اسکرپٹ کے ساتھ۔ ان کے کمرے میں آغائے ذکریا آغائے اسعدی نیوز ریڈر اور ٹرانسلیٹر تھے۔ ایک انجینئر آغائے وکیلی...... یہ سب میرے منتظر تھے...... گویا سچ مچ کے یہ افسران تھے۔ مجھے کبھی بھی عادت نہیں تھی کے اسکرپٹ پر OK ہو اور میں صرف پڑھوں۔ پھر میرا کیا کمال۔ مجھے پڑھنے سے نفرت تھی۔ میری اناؤنسمنٹ میں اک اپنا پرسنل ٹچ ہوتا تھا۔ بس میں آغائے فخر کے سامنے اسکرپٹ رکھ دیا۔ سنا تھا کہ گربہ کشتند بہ روز اول۔

جب تک پورا ٹیپ نہ سنا جائے میں بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ میں جا کر پہلے ریکارڈ اور ٹیپ ٹھیک کرنا چاہتی تھی اور میں نے ساری دقیق اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں آغائے فخر کو بتا دیں۔ انہیں کچھ نہیں معلوم تھا کہ کیا ہوتا ہے وہ آغائے ذکریا سے پوچھنے لگے آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا جب کہ یہ طریقہ ہے ٹیپ بجانے کا...... دوسرا ٹیپ آپ کیسے لگاتے ہیں اُس وقت سارا کام

ہی الٹ ہوگیا۔ میرا اسکرپٹ چیک کرنے کے شوق میں آغائے ذکریا کے خود لالے پڑ گئے......
آغائے اسدی نے فارسی میں میری تعریف کی کہ'' اخباروں میں ان کی تعریف چھپی ہے میں
نے پڑھا ہے یہ پاکستان کی مشہور اناؤنسر ہیں۔ سیر بین ایران کے نظارے میں اُردو میں ترجمہ
کروں گا میرے ساتھ آدھے یہ پڑھیں گی۔ آدھے میں تو صرف آہنگ اور آدھے گھنٹے میں
ان کا اسکرپٹ ہوگا۔ اخبار میں لکھتا ہوں ایران کے نظارے اور تاریخ زرتش میری لکھی ہوئی
ہے۔ یہ سب ہوئے 20 منٹ آدھے گھنٹے آہنگ برنامہ خانم سحاب۔'' تب جاکر میری جان
چھوٹی اور آغائے ذکریا نے میری زندگی عذاب کرنے کی اُسی دن سے سوچی۔

جھاڑ فانوسوں سے بڑے سے کمرے میں جہاں دیواروں پر خیام کی رُعبائیوں سے بنے
قالینوں پر بکھیری پڑی تھی، بیار بادہ اور خوبصورت حسین خاتون جام لیے کھڑی تھی۔ بڑی سی میز
کے بیچوں بیچ ایک گول مٹول سے فربہ انداز کے گینچے سے ریڈیو سیتان زاہدان ایران کے اسٹیشن
ڈائریکٹر تھے، رئیس آغائے فخر، جو بڑی تمکنت سے ملے۔ بڑے مہذب انداز سے میری فارسی
کی تہذیبا تعریف کرتے رہے۔ ذرا بھی میری کوتاہیوں پر نہ مسکرائے۔ چشم چشم کرتے زبان دکھ
رہی تھی۔ نئے نئے تعرفی طریقے خطابات۔ آپ آفس میں جب جاتے ہیں تو آنے والا میز پر
کام کرنے والے کو دیکھتے ہی کہتا ہے کہ'' دستے شما درد کند'' دوسرا جواب دیتا ہے'' دستے شما درد
نہ کند'' پھر دوسرے فقرے استعمال ہوتے۔ شاخیسلے خوش گل ہستند دوسرا کہتا ہے اُس وقت کہ
چشم شما خوش گل استند خستہ نہ باشی (کام کرتے کرتے تھک نہ جانا) یہ ایک دوسرے کو دن بھر
یہی کہتے رہتے ہیں...... پھر کہیں جاکر کوئی کام کی بات ہوتی ہے۔ یعنی درد نہ کند مطلب بہت
مدھم بہت سُست ہیں۔ دن میں چار پانچ دفعہ بغیر مانگے چائے کے استکان بھر دیئے جاتے ہیں
میز پر۔ بغیر دودھ کی چائے مصری کی ڈلیوں کے ساتھ۔ سلاد بہت کھاتے ہیں، پنیر اور نان یہ
خاص عام غذا ہے۔ پلاؤ چلاؤ کیا مخصوص۔ زرشت پلاؤ۔ شیر، بادام زعفران پستہ کھیرا یہ خاص
عام غذا ہے۔ چھوٹی الائچی کثرت سے استعمال ہوتی ہے۔ ایک ایک چیز علیحدہ علیحدہ کھاتے
ہیں، اخروٹ انگور سردا '' ہندوانہ'' تربوز بہت پسند کرتے ہیں۔ کراچی میں ایرانی سروس کے
آغائے شاہ پوربان جو انچارج تھے نے مجھے بالکل نہیں بتایا تھا نہ آغائے زرنگار ایرانی جو

پروڈیوسر جنھوں نے کنٹریکٹ پر سائن کروائے یہ نہیں بتایا تھا کہ ایران میں تمام دفتری کارروائی صرف فارسی زبان میں ہوتی ہے۔ دوسری کوئی زبان نہیں استعمال ہوتی۔ خط و کتابت تک فارسی میں انگریزی کوئی نہیں جانتا۔ آج بڑا ہی خراب دن تھا۔ پہلا پروگرام تیار کرنا تھا۔ آفس میں دو تین ریلیں پڑی تھی، الماریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ مشکل سے پانچ دس ریکارڈ تھے۔ پچھلے ہفتے کے ایک دو پروگرام فارسی کے کچھ ریکارڈ اردو برنامہ کی ساری الماریاں خالی پڑی تھیں میز پر چار کارڈ نوکنڈی اور کوئٹہ سے آئے ہوئے تھے یہ تھی پچھلی ڈاک کا اثاثہ۔ باقی میز بھی قلم سیاہی کی شیشیوں سے مرصّع تھی باقی اللہ کا نام...... اور میں آدھے گھنٹے کا آج ایک پروگرام لکھوں گی اور ایک ایمرجنسی کے لیے بنا کر ریکارڈ کروں گی۔ فارسی میں لکھا ہوا مجھے ایک نوٹ ملا۔ جو آغائے ذکریا نے مجھے ابھی ابھی سنایا تھا فارسی میں۔ مسکرا مسکرا کر خوش آمدید کہتے جا رہے تھے۔ کسی زمانے میں پاکستانی تھے اپنے رنگ کو وہ فارسی لہجے میں بھی نہ چھپا سکے۔ رات کا نشہ آنکھوں میں بیدار ہو رہا تھا۔ ہاتھ جو گرم جوشی میں ملا گئے تھے۔ سارا پرفیوم میرے ہاتھوں میں جذب ہو گیا تھا۔ یہ تھے میرے اُردو برنامے کے انچارج اور میں سچ مچ گھبرا گئی۔ کیا ہوگا بغیر خطوں کے بغیر ریکارڈوں کے۔ پھر سارے خطوط سارا کام فارسی میں لکھنا ہوگا میں تو بالکل گھبرا گئی۔ مگر چہرے پہ قابو رکھا۔ سوچتی رہی مگر مسکراہٹ کی ڈھال اوڑھ لی۔

ترکیب نمبر 1 عورت کا چلتر پن کام آئے گا۔ اندر کی خاتون نے گھنٹی بجائی مسکراہٹ ہمیشہ کام میں لو۔ ہاتھ ٹھنڈے برف ہوں تو پرواہ نہیں عقل نے سمجھایا اپنے ساتھ جو ریکارڈ لائی ہو وہ منگواؤ...... بہزاد چپڑاسی کو بلوایا۔ اماں کو لکھا ریکارڈ دیں...... یہاں تو بچہ بچہ ضبط کہتا ہے ریکارڈ نام یہ نہیں جانتے یہ لوگ ریکارڈ کرنے کو ضبط کہتے ہیں۔ غصہ ضبط کرنا نہیں۔ آوازوں کو ریکارڈ کرنا پروگرام ریکارڈ کرنا...... برنامہ ضبط کرنا...... ہر چیز نئی تھی۔ میری فارسی جو میں افغانستان کے پروگرام میں حاجی یعقوب صاحب کے کہنے پر پروگرام ریکارڈ کرا دیا کرتی تھی...... اس وجہ سے ایرانیوں کو معلوم ہوا کے میں فارسی جانتی ہوں۔ ایرانی فارسی بہت مشکل تھی خیر میں تو اب کود پڑی تھی ہٹنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر میرے پروگرام کا انچارج ایک بلوچ لڑکی کو لانا چاہتا تھا جو یہاں کی رہنے والی تھی اور فارسی لکھنا پڑھنا بھی جانتی تھی۔

ریڈیو ایران کے دو ذمہ دار افسروں نے مجھے یہاں بھیجا تھا۔ میں کیسے ان کو یہ بدنامی دیتی۔ مجھے اگر وہ بتا دیتے یا ایک دفعہ ہی کہتے کے دفتری کارروائی سب فارسی میں ہوگی تو میں انکار کر دیتی۔ لکھنا تو میں جانتی ہی نہیں۔ گرامر کے بغیر بولنا بھی مشکل مگر بچپن میں گھر میں سنی ہوئی زبان آشنا تھی۔ پھر افغانی پروگرام میں میری وجہ سے وہ صبح ریکارڈنگ کرتے تھے میں انٹرنل سروسز میں نوکر تھی ان کو مفت کی ایک اناؤنسر ملتی تھی۔ صبح جب جنوبی ایشیا کے لیے پروگرام کرنے آتی تو وہ آدھے گھنٹے کا پروگرام فارسی میں کر لیتے۔

ڈرامہ رٹنا ہی ہوتا تھا۔ لڑائی جھگڑے کا پروگرام ہوتا افغانستان سے لڑائی تھی اُن دنوں۔ حاجی صاحب بڑی لڑائیاں طنزاً گفتگو میں لکھتے تھے۔ میں اور ایک انجینئر لڑکا تھا جس کو گانے کا شوق پاگل پن کی حد تک تھا۔ وہ اُردو میں تو حاصل کر نہ سکا۔ فارسی میں حاجی صاحب کو پٹا لیا۔ اور گانے لگا فارسی کی غزلیں۔ کافی بے سُرا تھا۔ وہ بھی ریڈیو میں نوکر تھا۔ لحاظہ دو آرٹس مفت حاجی یعقوب کو مل جاتے...... مجھے کیا معلوم تھا۔ کوئی حالات انہوں نے نہیں بتائے کے زاہدان گاؤں ہے کوئٹہ شہر پھر بھی بہتر ہے یہ ٹنڈو جام سے بدتر ہے۔ خاک و ریت میں ڈوبا ہوا بلوچی نسل سے بھرا ہوا ایرانی اِکا دُکا آٹے میں نمک...... غربت عروج پر پھٹے ہوئے کپڑے لگائے بلوچ خاک و مٹی میں بھرے بالوں والے بکریاں چراتے نظر آتے جس میں ہر دوسری عورت بلوچی کھانے پکاتے نظر آتی...... بچوں کو اسکول لے جاتی نظر آتی۔ صبح سات بجے ریڈیو جانا ہوتا۔ میں سارے جھوٹے جھوٹے خط لکھتی۔ ہندوستان اور پاکستان کو ایک ساتھ محبت سکھائی تھی میں نے بھی اپنے ساتھ لائے ہوئے چالیس پچاس ریکارڈ پہلے تو ایک ایک آرٹسٹ کے ٹیپ کروائے۔ ریل گاڑیوں پر آتے جاتے مسافروں سے لوگوں کو لگا دیا کہ ہم ریکارڈ خرید لیں گے۔ ہندوستان جانے والے پاکستان کے آنے والے ریکارڈ لے آتے میں خرید لیتی اور لائبریری بنا ڈالی Tape لگا لگا کر فہرستیں بنا ڈالیں۔ دوپہر کو کھانا کھانے نہیں جاتی اور یہ کام کرتی۔ ہندوستان پاکستان کے دوست احباب کے نام لینے شروع کیے۔ تو اللہ نے میری محنت کے پھل دینے شروع کیے اور خطوط آنے شروع ہوئے پہلے پاکستان سے پھر آہستہ آہستہ ہندوستان سے۔ پوسٹ مین کو میں نے روک کر چائے پلانی شروع کی تا کہ جلدی خط ملیں۔

ہمارے مزاج اور ان کے مزاج بھی نزدیک نزدیک ہیں بعض چیزوں میں بہت آگے میری ڈاک بڑھنے لگی۔ ذہنی خوشی بھی بڑھنے لگی میری آواز میں شہنائی کی چمک بڑھنے لگی اور پندرہ بیس دن میں میری پڑھائی میں بھی مجھے مزا آنے لگا۔ بتول اور شگوفے آغائے عزیز نصرتی کی بہنوں سے میری ملاقاتیں بھی بڑھ گئیں۔ میری فارسی پڑھائی بھی اب دو گھنٹے کی ہوگئی۔ میرا ماسٹر آغائے نصرتی جو کسٹم میں افسر تھا اس کی بہن نبیل کی اسکول کی ٹیچر تھی اور میری دوست بن گئی۔ ہر وقت کی فارسی کی بول چال اور عرضی ونوٹ لکھنے کی عادت زیادہ ہوگئی۔ میں نے تن من دھن سب کچھ لگا دیا فارسی سیکھنے میں۔ ایک مجبور ماں جس کے بیٹے کو ایک پی پی چاہیے تھی۔ مجھے فارسی پڑھنی تھی۔ چاہے مجھے تیل کے بجائے آواز بیچنی تھی عزیز نصراتی کو انگریزی سیکھنی تھی میں نبیل اور عزیز کو ایک ہی سبق دیتی اور بتول اور شگوفے بھی ان کے سبق میں رات کے آٹھ بجے کے بعد شامل ہوجاتی۔ صبح ساڑھے سات بجے میں گھر کے پیچھے میرے اسٹوڈیو آجاتی۔ اسکرپٹ بناتی۔ ایک بجے تک ریکارڈ کرواتی۔ گھر نبیل کے ساتھ جاتی وہ اسکول سے اپنی کلفت کے ساتھ آجاتا۔ کھانا کھا کے دو ڈھائی بجے واپس ریڈیو آجاتی اور سات بجے تک براڈ کاسٹ ختم کروا کر گھر آجاتی۔ نو دس بجے کھانا کھاتی نبیل کو پڑھا کر خود پڑھتی۔ جلدی جلدی ...... یہ زندگی اس طرح گزری کے خود کو سوچنے کا کم موقع ملا۔ مگر میں ٹوٹی جارہی تھی۔ زاہدان خاموش اُداس اجڑا ہوا۔ ایک ببول کا درخت تھا۔ رات کو ٹھنڈ۔ دن کو گرم سورج کی تپش کہ اللہ مان۔ مجھے ایک عدد چادر خانم فخر نے آتے ہی پہلے ہفتے تحفہ میں بھیجی۔ پھر حمام میں دعوت دی جب کہ آتے ہی زہرہ سے پانی گرم کروا کر باورچی خانے میں میں اور نبیل نہا چکے تھے...... زہرہ کے لیے یہ کام زیادہ تھا۔ بے چاری کنوئیں سے پانی لاتی گرم کرتی۔ بالٹی برتن زہرہ خرید کر لاتی۔ مجھے ریڈیو اسٹیشن جانے کے لیے دو مختلف گھروں سے دو کالی چادریں تحفے میں آچکی تھی۔ بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ آخر بینک وغیرہ تو جانا ہی تھا۔ پھر دبی زبان میں زہرہ بھی میرا اور چپراسی بہزاد بھی مجھے بتا چکے تھے کہ خانم یہاں ہر عورت چادر پہنتی ہے۔ آپ ادارے جاکر اتار دیں گھر سے ادارے تک چادر پہنیں۔ یہ خانم فخر خانم بھی کہہ چکی تھیں۔ میرا جی اس بات سے ڈرتا تھا کہ ایک دفعہ پہنی تو چھ سال تک پہننی پڑے گی۔ دل گھٹنے لگتا۔ نہ جانے میں

کون ہوں۔ سوچ کر رونے کو جی چاہتا۔ وہاں معلوم ہوتا تو کبھی بھی نہ آتی اس زاہدان۔ اپنی جان کیسی عذاب میں ڈال لی۔ پھر آخر کار حمام کی مہمانی میں چادر پہننی پڑی۔ زہرہ نے سر میں کلپ سے چادر اٹکا دی وہ اتنی بڑی اور گھیر دار تھی کے سنبھلتی ہی نہیں تھی آگے سے کھل جاتی۔ جب تک دونوں ہاتھ اس میں مصروف نہ ہوں تو چل ہی نہیں سکتی تھی منہ ڈھکنا تو کجا۔

زندگی میں کیسے کیسے دن آئیں گے۔ مجھے معلوم نہ تھا مجھے کتنا مجبور ہو کر رہنا پڑے گا۔ میں یہ سب کیسے برداشت کروں گی۔ اصل نوکری تو اب شروع ہوئی تھی۔ اپنے ملک کی میری نوکری کوئی نوکری تھی؟ جس سے چاہا کام کروالو۔ اپنی من مانی۔ سحاب! کوئی مجھے کبھی بھی خفا نہیں ہونے دیتا۔ جو مجھے پسند وہ میں کرتی۔

بینک گئی تو کسی آسٹریلین ڈاکٹر نے مجھے انگریزی میں پتہ پوچھا کسی ہوٹل کا وہ اجنبی تھے۔ میاں بیوی دو بچے۔ زبان نہیں جانتے تھے ایک رات کا قیام مانگ رہے تھے۔ بچوں کو نہلانا تھا کپڑے دھونے تھے میں نے از راہ مہربانی اپنے گھر لے گئی۔ امّی سے ملایا۔ ناشتہ چائے کا کہہ کر آفس آئی۔ فوراً آغائے فخر نے بلوالیا ضروری کام سے۔ مجھے حکم ملا کے ابھی سی آئی ڈی آفس جاؤں اور بتاؤں کے میرے مہمان اجنبی ہیں میں نے ہمدردی میں انہیں کپڑے دھونے کھانا پکانے کی اجازت دی ہے۔ اس میں کوئی تعلقات نہیں۔ وہ زبان نہیں جانتے راہ گیر ہیں کل چلے جائیں گے کار میں مسافر ہیں۔ اور میں حیران پریشان، بارہ بجے میری ریکارڈنگ تھی۔ ریڈیو سے سیدھی سی آئی ڈی آفس گئی۔ کسی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں لکھا، پھر انگریزی میں انہوں نے ایک اور پوری ڈیٹیل لکھوائی کہ تہران جائے گی اور میں مجرم بنی شرمندہ سی واپس آئی تو اسٹوڈیو میں جانے کی اجازت ملی...... سارا آفس مجھے چپکے چپکے دیکھ رہا تھا۔

سارا محلہ مجھے گھور رہا تھا جب سات بجے شام کو گھر واپس جا رہی تھی۔ میرے گھر سے وہ بچارے مہمان جا چکے تھے۔ ان کو بھیج دیا گیا تھا۔ کیسا خاموش مہذب جیل تھا یہ میں نے کیا کیا خاموشی سے سہا۔ سانس لینا دشوار یہاں تو میرا گزر نہیں ہوگا اور سب سے پہلے اپنے پاکستان کے کونسلر کا خیال آیا۔ میرا اخلاقی فرض ہے مجھے سب سے پہلے وہاں جانا چاہیے تھا۔ میرا بھی

کوئی ہو، میرے ملک کا۔ اور میں بیٹے کو لے کر اسی وقت اپنے کونسلر کے گھر گئی۔ بغیر اطلاع کے کوئی اور ہوتا تو کبھی نہ ملتا مگر وہ دونوں میاں بیوی اتنے شفیق نکلے۔ میرے انتظار میں تھے ان کو سب کچھ معلوم تھا۔ میں پھر بڑی شرمندہ تھی کہ اب کیسے معافی مانگوں مجھے سب سے پہلے ان کے پاس آنا چاہیے تھا نوکری شروع کرنے سے پہلے۔ کسی نے کچھ بتایا ہی نہیں۔ برسوں سے نوکری کر رہی ہوں اپنے ملک میں کبھی کچھ ایسے حادثہ نہیں ہوئے۔ کونسلر صاحب بڑے مشفق تھے مجھے اور نبیل کو کھانا کھلایا تسلی دی کہ ایسا ہوتا ہے۔ یہ فورن سروس ہے۔ زہر لگی اپنی فورن سروس۔ قیدیوں کی طرح رہی۔ اسی شام جب ہم آغائے نصرتی کی فیملی کے ساتھ فلم دیکھنے گئے تو گمرک (کسٹم والوں کو گمرک کہتے ہیں) سے پاس ملا اور نصرتی آغائے فخر سے سائن کروا کے لائے تھے۔ اُس پر بھی اجازت چاہی تھی ورنہ مجھے اندر نہیں جانے دے رہے تھے۔ حمام کی دعوت پر بھی شاید اجازت لی ہو۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ ایران کے رسم و رواج نشست برخواست سیکھتے سیکھتے میں تو تنگ آ گئی۔ آئے دن ابھی دفتر پہنچے قاصد کھڑا ملتا۔ ''آغائے رئیس فرمودین۔ اگر زحمت نہ باشی شما تشریف بیارین۔'' اور میں اُسی وقت سب کام چھوڑ حاضر۔ شاہی خاندان کی نوکری تھی۔ سارے حالات مسکرا مسکرا کر پوچھتے رہتے کل رات کیسے گزری، بڑے مہذب طریقے سے، بیٹا کیسا ہے کوئی زحمت تو نہیں ہوئی۔

یہ روز کا معمول تھا۔ پھر جب تک چائے کا استکان ختم نہ ہو اٹھ نہیں سکتے۔ تہذیب کے خلاف تھا۔ کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا کپڑے پھاڑ کر سڑک پر بھاگوں تو تہذیب کے سارے دائروں کو عبور کر جاؤں اور اپنے بیٹے کی انگلی پکڑ کر ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ پاکستان کے بارڈر سے گزر جاؤں کوئٹہ کی سرحد پر جا کر گر جاؤں مجھے بچالو میرا دم گھٹ رہا ہے۔ کوئٹہ کے ان سب پہاڑوں سے معافی مانگ لوں گی جہاں ایک دفعہ میں نے سیبوں کے باغوں میں کھڑے ہو کر دعا مانگی تھی کہ اے خدا پہاڑوں کے اُس طرف حافظ خیام کا شہر ہے۔ ایران مجھے دکھا دے اور اب میں اسی محبت میں آ گئی۔ دوسری وجہ نہ نبیل کے باپ جاتے نائیجیریا نہ میں اس ضد میں کے میں بھی باہر جا کر نوکری کر سکتی ہوں یہاں آتی۔ یہ نوکری اتنی جلدی قبول نہ کرتی۔ میری انا نے مجھے دکھ دیے۔ اب میں بھگتوں گی۔

ایرانی دوستوں کے ساتھ

کل یہ ٹیلیگرام آیا تھا تہران سے آغائے روحانی کا۔ تم ہمارے پروگراموں کو خراب کرنا چاہتی ہو۔ تمہارا چھ سال کا کنٹریکٹ ہے۔ تم نہیں جاسکتی ہو۔ جب تک ہم کو کوئی نئی اناؤنسر نہیں ملتی۔ اور میں سہم گئی۔ کیا میں یہیں مرجاؤں گی! میرا بچہ اکیلا اس اجنبی شہر میں رہ جائے گا اور میں نے اپنے پاکستانی کونسلر کو فون کر دیا جو بہت ہی مشفق تھے۔ وہ اور ان کی بیوی دونوں ہی میرا بہت خیال کرتے تھا۔ پاکستان سے ہر ہفتے ٹرین اُن کے لیے چیزیں لاتی۔ پھل، کھانے پینے کی چیزیں ایران میں بہت مہنگی تھیں۔ پھل تو ایران میں اتنے مہنگے کہ الامان۔ نبیل مالٹے سیب کھانے کا عادی۔ وہ اپنے راشن کے کوٹے کے ساتھ میرا بھی راشن منگوادیا کرتے تھے پاکستان سے۔ اللہ نے اُن کے دل میں رحم ڈالا اور میرے لیے گورنر جسے اُستند ار کہتے ہیں اُن کے گھر پر کھانے پر مدعو کیا گیا۔ اُدھر ایک خط جو کہ طیب بھائی جو پاکستانی ایمبیسی میں ایمبیسڈر تھے نے اُن کو لکھ دیا کہ میں یہاں زاہدان میں اناؤنسر ہوں چھ سال کا کنٹریکٹ ہے تین ماہ سے رات رات بھر کھانستی ہوں پسلیاں دُکھ گئی ہیں سانس نہیں لے سکتی۔ یہ لوگ ایک وقت کی بھی چھٹی نہیں دیتے ہیں ذہنی اور جسمانی مریض ہوں اکیلا بچہ نہیں سنبھال سکتی وہ بڑا ہو رہا ہے اب وہ اکیلا نہیں رہ سکتا اُس کا باپ نائیجیریا میں نوکر ہے وہ بہت بلا چکا ہے۔ میں نوکری چھوڑنا چاہتی ہوں یہ استعفیٰ منظور نہیں کرتے مہربانی سے مدد کیجیے میں ایک پاکستانی سیٹیزن ہوں۔

اُدھر اُستند ار (گورنر) نے مجھے تجویز بتائی کہ تم فارسی بولتی ہو تمہارا پروگرام بہت مشہور ہے اتنے خط آتے ہیں کہ میزوں کی میزیں بھر جاتی ہیں۔ اس وجہ سے وہ تم کو نہیں چھوڑنا چاہتے۔ تم کو سب پسند کرتے ہیں۔ فارسی بولنے والی اناؤنسر کی ضرورت ہے سارا دفتری کام فارسی زبان میں ہوتا ہے اگر کوئی دوسری خاتون اس طرح کی مل جائیں تو میں تمہیں سب سے پہلے بھیجوں گا تم خود کوئی ایسی اناؤنسر پاکستان سے ڈھونڈ دو۔ تو ابھی تم کو بھیج دیں گے۔ جب میں نے اُن کو اپنے میاں کے سارے خطوط دکھائے کہ میں اپنے بچے کی خاطر جارہی ہوں تو پھر خاموش ہوگئے۔ تجویز بتائی کہ تمہاری آواز تمہارے لیے بڑی قیمتی ہے۔ تم کہو کہ میرا خیال ہے کہ کنویں کا پانی بعض لوگوں کو سوٹ نہیں کرتا سُو تم کو بھی نہیں سوٹ کرتا اس وجہ سے تم چھوڑنا چاہتی ہو۔ اپنے ملک جانے کے بعد اگر بہتر ہوئی تو پھر سے آجاؤں گی۔ فی الحال کوئی تھوڑی

دیر کے لیے رکھ لیجیے اور یہ ترکیب کام آئی اور ڈاکٹر نے بھی سرٹیفکیٹ دیا کہ الرجی ہے یہاں کی خاک سے اور یہ دمہ کی پہلی اسٹیج ہے مگر اس میں ایک شرط یہ رکھی گئی کہ دو ماہ کا ایک پورا پروگرام ریکارڈ کر کے دے کر جاؤں۔ جب کہ پندرہ ہزار تومان ایک ماہ کے ہوتے تھے۔ دو ماہ بغیر تنخواہ کے چھٹی ملے گی اور میں اتنی عاجز اور پریشان تھی کہ ایک منٹ میں دستخط تو کر دیئے۔ مگر راتوں کی نیند حرام ہوئی کہ دو ماہ کا پروگرام الگ ریکارڈ کرنا بغیر تنخواہ کے۔ چار سال کی محنت سے جمع کیے ہوئے پیسوں کی چیزوں سے بھرا گھر کوئی ایسے ہی لے لے اور مجھے اور میرے بیٹے کو ٹکٹ دے دے اور یہاں سے آنکھ بند کر کے ایسی جاؤں کہ پھر کبھی پلٹ کر نہ دیکھوں اس حافظ، شیرازی، فردوسی کے شہر کو...... جو کچھ مجھے صرف زاہدان کی شکل میں ملا۔ جو کہ تُنڈو جام سے بھی بدتر تھا۔ سیٹی بجی ریل پاکستان جا رہی ہے کیسا دل مچلا۔ چپکے سے بیٹے کو لے کر بھاگ جاؤں اس ٹرین سے۔

آغائے روحانی میری شکایت پر تہران سے آ رہے تھے۔ آغائے فخر مجھے کچھ کھنچے کھنچے سے لگے۔ کیا لکھا آپ نے تہران۔ مجھے پوری بات بتائیں۔ وہ کئی دفعہ مجھ سے پوچھ چکے تھے۔ مجھے کیوں نہیں بتایا کہ کیا زحمت ہے میں ٹھیک کرتا۔ میں کس لیے اس کرسی پر بیٹھا ہوں نہ جانے وہ لوگ کیا سوچیں گے؟

کچھ بھی نہیں میں یہاں کام نہیں کر سکتی مجھے لندن جانا ہے۔ میرا گلا خراب ہے۔ یہاں پینے کا پانی ٹھیک نہیں مجھے کھانسی رہنے لگی ہے۔ میرے بیٹے کی تعلیم ٹھیک نہیں اس کو ہمیشہ صرف فارسی نہیں پڑھائی جا سکتی اس کو انگریزی آنی چاہیے تاکہ وہ دنیا کے ساتھ چل سکے۔ میں لندن واپس جاؤں گی وہاں میرے میاں نے گھر خریدا ہے اس میں ہم رہیں گے اور یہ پڑھے گا۔ اس کے باپ، دادا، ماموں سب کے خط آ رہے ہیں۔ میری ماں بھائی سب خلاف ہیں۔ وہ سب مجھے واپس بلا رہے ہیں میرے بیٹے کی پڑھائی خراب ہو رہی ہے۔ اُسے لندن میں پڑھنا ہے۔ اس کے دو سال میں نے ضائع کر دیئے زندگی کے دو سال۔ میں اب زیادہ نہیں رہ سکتی۔

اور سب کے منہ بن گئے۔ انجینئر سے چپڑاسی تک مجھ سے خفا ہو گئے۔ تمہیں ایران

کیوں نہیں اچھا لگتا۔ ہمارا ملک تو بڑا خوبصورت ہے ہماری شناخت، کلچر، تہذیب...... آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ اور وہ سب کے سب مجھ سے خفا تھے۔ آغائے روحانی سے میری میٹنگ کے بعد تو میں بالکل تنہا رہ گئی تھی۔

نائیجیریا

چار پانچ سال نبیل کے ساتھ ایران میں گزارنے کے بعد تنہا اجنبی شہر، اجنبی لوگوں کے درمیان ایک کیئریر وومن آج سے ہاؤس وائف بن کر ایک اور اجنبی شہر میں پھر سے اپنے بیٹے کی خاطر اسی کے باپ کے پاس آ گئی۔ دنیا کی نظروں میں اس کی بیوی مگر تنہا ماں اور نوکرانی کے روپ میں رہنے آ گئی۔ اجنبی کے پاس...... اللہ ہی مدد کرنے والا ہے اتنے بہت سے سال تنہا اپنے بچے کی ماں بن کر پیسے کمانے کے لیے میں نے اتنی سخت زندگی ایران میں گزاری...... اپنی ماں اور بھائیوں کے بغیر نبیل کو پالنا گو کہ ایک نوکرانی ''زہرہ'' جسے ایران میں ''کلفت'' کہتے ہیں اس کا بھائی نبیل کے کھیلنے کے لیے نوکر رکھا...... مگر نبیل...... ہر کار کے گزرنے پر سمجھتا تھا کہ اس کا باپ کار چلا رہا ہے...... پی پی...... پاپا کے نعرے وہ دن میں کئی مرتبہ لگا تا رہتا اور یہ پاپا، پی پی کی آوازیں میرے ساتھ گھر سے آفس تک، ریڈیو سیستان تک میرے ہمراہ رہتیں...... لکھتے وقت، پروگرام ریکارڈ کراتے وقت میرے اندر ایک ذمہ دار ماں، ضدی عورت پر تبسم کرتی رہتی...... سنو تم اپنی انا اور ضد کی خاطر اپنے بیٹے سے باپ کی محبت چھین رہی ہو۔ اسکول سے گھر آ کر ماں غائب، گھر جس کے دروازے کھڑکیاں آنگن تک نئے یہ بچے پر ظلم نہیں تو کیا...... کھانا کھا کر ضد کرکے زہرہ کو مجبور کرتا تھا کہ ماں کے پاس لے چلو میں نہیں

سوؤں گا...... پھر میرے دفتر آ تا تین پہیوں کی سائیکل پر۔ میرے پاس بیٹھا قلم دوات سے لکھتا رہتا کاغذ پہ کاغذ خراب کرتا رہتا اور میں ڈرتی رہتی کہ سفید قیمتی کاغذ ضائع ہو رہے ہیں۔ یہ دفتر کا کھیل میرے لیے کتنا دشوار ہوتا...... ریکارڈنگ سے پہلے میں سمجھا بجھا کر رہ جاتی...... یک سوئی پڑھتی اسکرپٹ کی ہر لائن نبیل کی طرح روتی چیختی کاغذ پر دوڑتی نظر آتی۔ نہ جانے گھر پر ابھی تک رو رہا ہوگا۔ وہ ماں جو میرے سارے وجود پر پھیلی ہوئی تھی میرا گلا گھونٹتی رہتی...... میرے (مضبوط) ارادے نرم پڑتے جاتے تھے۔ پھر میری ماں نے بھی میری مدد نہ کی وہ آ تیں...... سرخوش بھائی...... انہیں اپنے بیوی بچوں کو بھیج دیتے وہاں سے اور میری نبیل کی عید ہو جاتی مگر کب تک ایک نہیں دو مہینے پھر وہ گھبرا کر جانے کے لیے تیار ہو جاتیں بھئی بہت ہو گیا اب ہم جائیں گے...... اور نبیل نانی جان کی منت کرنے کو تیار...... میں بھی پاکستان جاؤں گا ایران نہیں اچھا ماں چلو...... وہ غریب روتا رہتا اور ضدی ماں وعدوں، جھوٹے خوابوں میں الجھی صبح سے شام تک ریڈیو ایران کے سہرے سجاتی رہتی۔ اپنی آواز کے ریشم میں لپیٹ کر نئے نئے چمکیلے لفظوں کی لڑیوں سے نوبہار پھولوں کی خوشبوں سے آواز میں تازگی بخشتی رہتی۔ یہ ریڈیو ایران ہے، زاہدان ہے...... لوگوں آؤ میرے قریب آ جاؤ...... میں تمہیں نئے نئے نغمے سناؤں گی ایران کی تہذیب کے گہوارے بس اس اجنبی شہر کے جھروکوں سے محبتوں کی سیر کراؤں گی...... تم قریب آ کر سنو...... اور یہ آواز میرے دل کے قریب سے اٹھتی...... دکھ درد میرے چاروں طرف جمگھٹا لگائے رہتے جب میرا بیٹا میرے بازوؤں پر سر رکھ کر اپنے باپ کے ساتھ پی پی میں سوار دور چلا جاتا...... اور میں پچھتاؤں کا بازار لگائے اپنے یوسفِ ثانی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جاتی اور سو جاتی...... آج تک کسی سے سہارا ہی نہیں ملا کون تمہارا سچا دوست تھا۔ تم اس پھولوں کے شہر سے جس کا دروازہ تم نے خود بند کیا تھا...... اس کوچہ تاریک میں کیوں نکل گئی جہاں سے ماں بن کر اندھیروں کے اب اجالے راستوں پر آئی ہو تو اس معصوم بچے کا...... خوبصورت بچے کا کیا قصور...... اس کو یہ سزا کیوں...... اس کا گھر اس کا کمرہ اس کی آیا اس کا شہر ...... اس کے چاہنے والے چہرے سب چھین لیے...... کیوں ...... اس کا کیا قصور...... بولو ضدی عورت۔

اس آدمی کی ذہنیت جو اس کا باپ ہے اس سے بدلہ کیسا ...... یہ نیا پہلو تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ ظلم کا یہ سرا اس کے ہاتھ میں اس نئے ملک نے تھما دیا ...... بے چارگی میں غریب الوطنی نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اپنے بچے کا اسے کبھی خیال ہی نہ آیا کہ اس کا کیا ہوگا ...... اس کی آیا کا لڑکا لے کر آئی پاکستان سے وہ بھی چلا گیا اپنے ڈھیر سے پیسے بھی اس نے رد کر دیئے پاکستان جاؤں گا مجھے ایران نہیں رہنا ...... کئی مہینوں پی پی پاپا ار عنایت گل مانگتا رہا ...... اور میں کھلونوں سے کمرہ بھرتی رہتی ...... تم آج سارا کمرہ گندہ کر دو خوب رنگ لگاؤں کاغذ پر ...... یہ برش اور رنگ لائی یہ ایرن یہ کاغذ ...... یہ بلیک بورڈ یہ رنگین چاک اور وہ کھلکھلا پڑا ...... کئی گھنٹے آوازوں کے شور میں اپنی خوشی کے اظہار پر رنگوں سے بدلے لیتا رہا آخر کتنے دن ...... پھر نبیل کے باپ اور دادا ماموں کے خطوط کی تحریریں ...... ان کے تیکھے جملے جمع ہوتے رہے ...... میری آواز پاکستان کے خط کا جواب دیتے ہوئے لرزنے لگی ...... چٹانوں جیسی سختی، برق جیسی چمک کے ساتھ کراچی ...... لاہور کے نام کے ساتھ میں مڑ کر جواب دینے لگی اور راتوں کو مجھے کھانسی کے دورے پڑنے لگےتم واپس آ جاؤ مجھے نبیل بہت یاد آتا ہے۔ ہم دونوں کی کبھی نہیں بن سکی ہم علیحدہ کمروں میں رہیں گے مگر ہم دونوں کے درمیان ہمارا بچہ ہوگا اس کو پڑھنا ہے ...... میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا ...... دونوں طرف سے مجھے نوٹس مل چکا ہے میری کھانسی مجھے چین نہیں لینے دیتی تھی، ڈاکٹر کی دوا بھی کام نہیں کر رہی تھی، میرا دن رات جی چاہتا ہے اب کے کوئٹے سے ٹرین آئے اور میں چپکے سے نبیل کو لے کر بھاگ جاؤں پاکستان۔ مجھے اس گھر سے کچھ بھی نہیں چاہیے ...... میرا تو اس ملک میں کوئی نہیں ...... استعفیٰ دو تو تہران سے آدمی آ جاتے ہیں تمہیں کیا تکلیف ہے ...... تنخواہ بڑھا دیتے ہیں ...... تمہارے میاں کو ہم نوکری دے دیتے ہیں ...... بچے کا انگریزی اسکول نہیں ہے ...... میرے بچے کا مستقبل خراب ہوگا۔

یہ نائیجیریا ہے۔ کالے پہاڑ سرخ زمین ...... گل مہر کے درخت، سبزہ سے چاروں طرف ڈھکا ہوا شہر ''کدونا'' ...... یہ کدونا ہے۔ نائیجیریا ...... پانچ چھ سال سے نام سنتے سنتے اپنے عزیزوں جیسا لگنے لگا ...... جیسے ہمارا رشتہ دار ہو۔ چلو یہ منزل ختم ہوئی۔ آج سے سحاب قزلباش

ختم خانم پاکستان تمام شد...... آج سے میں مسز گل کا روپ دھار لوں گی۔ چاہے مسز ہوں یا نہ ہوں...... کار میں بیٹھی مسز گل۔ مہمانوں میں بچوں کے ساتھ نبیل کی تو عید ہوگئی۔ کار اور پی پی سے نجات ملی...... خدا کا شکر ایران میں بچہ کبھی کبھی تو مجھے یتیم لگتا تھا۔ جب کسی محفل میں جاتی سب کے باپ گودوں میں بچوں کو لیے آتے جاتے اور میرا بچہ ہر بچے اور اس کے باپ کو کیسے دیکھتا تھا۔ آج صبح سے نبیل جہاز میں سوتا رہا۔ اس کو کوئی بے چینی نہیں تھی...... ہوائی جہاز میں کھانا کھاتے ہی میں نے بتایا تھا کہ تم دو تین گھنٹے میں کدونا پہنچ جاؤ گے پاپا تم کو ایئرپورٹ پر لینے آئیں گے...... اور وہ اطمینان سے کھڑکی سے دیکھتے دیکھتے سو گیا تھا اس کے چہرے پر سکون تھا۔ جہاز کی کھڑکی سے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے ڈبوں جیسے لال چھتوں والے مکان نظر آرہے تھے۔ لندن رہنے کے بعد کوئی چیز نئی نہیں لگتی...... ہاں حیدرآباد دکن یاد آجاتا ہے۔ بنجارہ ہل کے کالے کالے پہاڑ...... سُرخ مٹی گل مہر کے سُرخ سُرخ پھولوں سے بھرے ہوئے درخت، سرسبز زمین ٹھنڈا ٹھنڈا سا شہر...... ڈھاکہ...... چٹاگانگ جیسا...... جیسے یہ سارے شہر ایک جیسے ہی ہوں۔ یہاں بارش بھی اس قدر تیز ہوتی ہے اور بجلی کی چمک آسمان سے اُتر کر زمین تک بے قرار پھرتی ہے...... وہ دیکھی نہیں جاتی۔ ایک کڑک کے ساتھ سارا وجود ہل جاتا ہے...... ایسی برق کی دل دہلانے والی آواز پھر چاندی جیسی چمک جس میں حضرت موسیٰ کی آنکھیں بھی حیران ہوگئی تھیں...... ایسی چمک کا کون تاب لا سکتا ہے۔ میری تو زندگی دہل گئی اس آواز اور برقی چمک سے...... آسمان سے زمین تک چند سیکنڈ کھڑی رہتی ہے...... کمروں میں اندر پردوں کے باوجود ایسا اجالا ہوجاتا ہے یہ بجلی کی چمک کڑک...... ڈھاکہ کی مجھے وہ طوفانی رات یاد دلاتی ہے...... چٹاگانگ ڈھاکہ...... حیدرآباد دکن...... اور افریقہ نائیجیریا کے چاروں پانچوں شہر ''بوس'' تو بالکل چٹاگانگ کی طرح کا ہے...... دریا میدان پہاڑ اور سبزہ ہی سبزہ۔ کالے پہاڑ سُرخ مٹی کی ڈھکی ہوئی بجری کی سڑکیں...... گل مہر سُرخ سُرخ پھولوں سے بھرا ہوا سب ایک جیسا لگتا ہے...... افریقہ میں کالے پہاڑوں سے ملتے جلتے لوگوں کے رنگ حیدرآباد اور چٹاگانگ ڈھاکہ کے سانولے سلونے رنگ بھی ویسے ہی ہیں...... صرف زبان مختلف ہے قبیلے رسم و رواج مختلف...... ڈھاکہ، چٹاگانگ میں لمبی لمبی چھال کے درخت، لمبے سیاہ کھلے بالوں

سفید لال کنی کی ساڑھی پہنے ناریاں ویسی لمبی لمبی آبنوسی گردنوں کی مالک غرور سے سر اونچے کیے گھڑے اٹھائے نظر آتی ہیں۔

تاریخ کی انسیت بھی ختم ہوئی، دن رات کیسے پے بہ پے ایک دوسرے پر گرتے جارہے ہیں۔ اس سرمئی پردوں سے ڈھکے آسمان کے قریب میں اپنی ہوٹل کی بڑی کھڑکی کے پاس کھڑی سوچ بھی نہیں سکتی کہ میں سچ مچ کیا سوچ رہی ہوں۔ بند شیشوں سے پھیلتی ہوئی تیز بارش کا پانی ایک دوسرے سے چمٹتا ہوا شیشوں پر سے پھسل رہا ہے۔ مسلسل۔ میرے دل کی گہرائیوں میں کئی نئے غم چونک اٹھے اور اس دل کے خوں کی گلابی پر نثار ہورہے ہیں۔ میرے غم آج یوں موج در موج تھم گئے۔ پھر اس فضا کی نمی پر دل بجھا بجھا سا ہے۔ بھلا اس اجنبی شہر میں مانوس چہروں کو ڈھونڈنا کیسی بے وقوفی کی بات ہے نا۔ تم کو تو میں کبھی بتاتی ہی نہیں۔ ویسے تم سب کچھ جانتے ہو اداسی سے تمہیں چڑ ہے تو تو بس خوشی پہ نثار ہو...... باہر بارش ہو رہی ہے۔ سُرخ پھولوں کے درخت سبز پتیوں میں سے نکلے میرا منہ چڑا رہے ہیں میرے غم دھکا رہے ہیں۔ وہ بھی تمہاری طرح سودائی تھا نا...... اپنی بات منوانے کی ترنگ میں، پھولوں کے ڈھیر لگا دیتے تھے سڑک پر، ڈھاکے کی اُس طوفانی رات میں اور اس ادھوری شام نے کتنے ہی گھنٹے سمیٹ لیے۔ نائیجیریا میں اس وقت رات کے دس بجے ہیں، ابھی ابھی طوفان ختم ہوا ہے۔ درخت نہائے دھوئے، بھیگے چپ چاپ کھڑے ہیں۔ افریقہ کی مٹی بھی سرخ ہے تمہارے ڈھاکے کی مٹی کی طرح۔ کب سے سونے کی کوشش کر رہی تھی مگر یہ میرے سارے بچھڑے مہمان جب چپکے چپکے چلے جائیں گے تو میں پھر چپکے سے سو جاؤں گی۔ اب تو سڑکوں کے چراغوں کی روشنی بھی کم ہو رہی ہے۔ افریقہ کی لیلائیں درختوں کی آڑ میں اپنی اپنی حدوں میں چھپی کھڑی ہیں۔ اب رات آ رہی ہے اور ان کی تجارت کا وقت اب شروع ہوا ہے۔ میں اُن لیلاؤں کی بات نہیں کر رہی جو اس ہوٹل کے اندر شراب خانوں اور قہوہ خانوں میں نوکر ہیں......

۱۴ اپریل: شام پھر بن سنور رہی ہے۔ باہر سرخ پھولوں کے درخت کیسے دکھتے تازے زخم لگتے ہیں۔ جیسے کائنات کے گھاؤ ہوں...... میرے تمہارے ننھے منے غم، لالہ و یاقوت، لالہ

کے پھولوں کی سُرخی، تازگی، اور یہ سرد ہوائیں۔ درخت کے پتوں نے تالیاں بجانی شروع کردیں۔

پات کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہیں
سنتے ہیں کہ بہاراں ہیں

صبح سے یہ گنگنا رہی ہوں، پیچھا ہی نہیں چھوڑتے...... چلتے ہو تو چمن کو چلیے۔ کس کے ساتھ؟ وہی عورت چپکے سے پوچھتی ہے۔ وہ عورت جو کبھی کبھی چپکے سے آجاتی ہے اور لاجواب کر جاتی ہے۔

تیرے راہ رو سب کہاں ہیں
اتنے اجنبی پن ہیں ان بہاروں میں

میری مظلوم صلح کن عورت جواب دیتی رہتی ہے۔ یہ سارے پھول میرے ہیں۔ یہ تو میری اڑان ہے جو اتنے دور لمبے سفر چند سیکنڈ میں طے کر جاتی ہوں وہ سب اپنے اپنے وطن میں شادماں ہیں۔ کون بچھڑے لوگوں کو یاد رکھتا ہے اک تم ہو کہ اپنے دُھونی رمائے بیٹھی ہو...... جہاں بھی چھاؤں ملتی ہے۔ سکون سے زندگی گزارنی تو آئی نہیں۔ اب اگر پھر سے گھر بسانے کا سوانگ رچایا ہے تو کچھ دن آرام سے گھر والوں کی طرح مزے کرلو بیوی بن کر۔ مرد تو اتنا معصوم ہوتا ہے بالکل بچوں کی طرح ہوتا ہے۔ تم بن سنور کر اس کے گھر کو سجاؤ۔ اس کو بتاؤ کہ تم ہی اس کے گھر کے شہنشاہ ہو یہی کہتی رہو...... میں ٹھہری تمہاری رعایا، تم جو کہو سرآنکھوں پر سرتاج۔ سب تمہاری زندگی تک ہے ورنہ اس لونڈی کا کیا مقدر...... در در کی ٹھوکروں کے بعد آپ کے قدموں کی وجہ سے میرے دکھ درد دور ہوگئے۔ مہمانوں کے سامنے گھر کے مالک کے گن گاؤ...... تو تمہارا کیا بگڑے گا۔ اُسی کے روپے پیسے سے تو یہ گھر چلتا ہے۔ پھر دیکھو تمہارے وارے نیارے ہوں گے۔ کچھ دن تک تو وہ تمہارا رہے گا۔ ہر وقت سچ بولنا بھی تو راس نہیں آتا۔ ساری زندگی عذاب میں گزری۔ سچ کی چاندی جیسی چمک بڑی بھاری پڑتی ہے۔ جھوٹ کی تو گنگا جمنی چمک ہے دل بھی ٹھنڈا اور آنکھیں بھی ٹھنڈی رہتی ہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ہوٹل کی ہر وہ عورت جو تم کو دیکھ کر مسکراتی ہے چور نظروں سے تمہارے دل کے پاس آکر جو کچھ

کہہ جاتی ہے وہ تم کو راتوں کو سونے نہیں دیتا...... سب تمہارے بے چین ذہن کی خرابی ہے۔ تم ان عورتوں سے کیوں گھبراتی ہو جو ہوٹلوں میں رہنے والوں کے لیے برآمدوں میں سیڑھیوں میں بیٹھی راہ تکتی ہیں۔ کچھ تھوڑے سے پیسے ہی تو لے لیتی ہیں...... تھوڑی دیر کے لیے یہ بے چارے ڈکھیا اکیلے کمروں میں پڑے کیا وظیفے کریں۔ تم سالوں باہر رہو، چھٹی پر آؤ اور ایک مہینے رہنے پر مالک بن جاؤ پورے سالوں کی۔ اور وہ میرے اندر کی عورت کیا کیا سمجھاتی...... وہ ہمیشہ ایسے کہتی رہتی اور میں خفا ہو جاؤں تو چھپ جاتی ہے۔

ساری عورتوں نے یہی تو کہا تھا اُس سے جب وہ ہار کے جھک مار کے پھر سے بیوی کا سوانگ بھرے اس ملک میں آئی تھی۔ سب کیسے خوشی خوشی آئی تھیں پھر کھانے کے بعد جاتے ہوئے کہہ گئی تھیں۔ بھئی ہم سب آپ سے خفا تھے۔ بھلا اپنے میاں کو چھوڑ کر بچے سے باپ کو علیحدہ کر کے کوئی شریف عورت دوسرے ملک میں نہیں رہتی۔ جہاں خاوند وہاں بیوی بچے۔ اور میں مسکرا مسکرا کر کہتی رہی آپ ٹھیک کہتی ہیں مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بس نوکری تھی۔ بڑی مشکل سے استعفیٰ منظور کیا۔ تو میں آئی۔

کدونا میں نہ جانے کون سا دن ہے۔ کل میں دوسری کھڑکی سے جو ہوٹل کے کمرے کے باہر ہے اُدھر سے سوئمنگ پول پہ بکھرے ہوئے جسموں کی نمائش سے محظوظ ہو رہی تھی۔ وہ کالا پیلا سا جسم تلاش کر رہی تھی جس کے سیاہ بال دُو حصوں میں منڈھے ہوئے تھے۔ وہ جسم اس کو بہت ہی پسند ہے۔ کل اُس نے ایسے ہی casual انداز میں بتایا تھا اور جلدی میں مرغی کی پوری ٹانگ منہ میں رکھ گیا تھا اور خوب زور زور سے چبا رہا تھا۔ اب میں اکیلے میں اس کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرے پاس سب کچھ ہے فقط اب جسم نہیں تو کیا؟

اور ادھر وہ اب تک بے تحاشہ جسموں کی طرف بھاگتا رہتا ہے۔ اور میں اپنا جسم چھوڑے روح کی پیاس بجھانے کی فکر میں رہتی ہوں۔ اس کی روح پتہ نہیں کہاں ہوتی ہے۔ اس کی روح تو کیا جسم کی بھوک بھی میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ وہ تو ایسا ظالم ہے۔ اُسے تو پیار و محبت کا لفظ بھی نہیں معلوم ہے۔ اس کو روح کچلنے میں خوشی ہوتی ہے یا پھر نیلے پیلے اودے جسم

توڑنے مروڑنے پر اس کی آنکھیں کیسی چمکتی ہیں۔ شکاریوں کی طرح کمروں کے شیشوں سے نظروں کی کمندیں پھینکنا اس کا شیوہ ہے۔ سگریٹ کے دھوؤں کے نقاب اوڑھے پتہ نہیں کہاں چلا جاتا ہے۔ مجھے کبھی کبھی رحم آتا ہے اس کے اوپر۔ اچھا ہی ہوا میرا جسم خراب ہوگیا ورنہ توڑنے پھوڑنے کی خواہش اس اندھیرے کمرے میں اکثر ہی جاگ اُٹھتی۔ روح کے باغ و بہار کے نکھار کا وہ قائل ہی نہیں تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ دہقان ہو اور کھیتوں سے بل اُٹھا لایا مجھ پر دھڑ سے پھینک کر بھول گیا اور خود شہروں کی روشنی میں کھوگیا ہو۔ وہ تو بل چلانے کی جدوجہد کا قائل ہے۔ محبت سے روٹی کمانے کا قائل نہیں۔ اس کو سر پر رکھے ہوئے ہرے کھیتوں میں اٹھلاتی، کھانا لاتی ایک دوشیزہ چاہیے تھی۔ بس تھوڑی دیر کے لیے ہمیشہ کا سودا نہیں۔ اور اِدھر میں ثمرقند کے دریچوں سے ریشمی پردوں کی اوٹ سے کیسے بلالائی، کہاں سے بلالائی۔ آؤ ہمارے شہزادوں اس بہتی نہروں کا پانی پیو، آؤ میرے پاس آؤ اور دھیمے الفاظ سے محبت کی کہانی سناتے رہو۔ اُسے وقت کو ضائع کرنے کی کہاں فرصت......

کدونا ہمڈالہ ہوٹل ...... آج صبح صبح میں سیر کے لیے گئی، اکیلی۔ دونوں باپ بیٹے گلے میں باہیں ڈالے سو رہے تھے۔ اچھا منظر ہے۔ باہر دھوپ ہے، بالکونی پر گلاب کے پھول کھل رہے ہیں۔ موت کا قرب بھی عجیب تماشے کرتا ہے۔ کل میں نے اپنے برآمدے کی کھڑکی سے تازے کھلے پھولوں کو کس حسرت سے دیکھا تھا، آج وہ سب مسکرا رہے ہیں۔ دیکھا! تم نے...... کل تم کو خدا حافظ کہا تھا...... اور آج تم تو زندہ ہو، سلامت ہو...... اور اگر تم سب اتنی اونچائی پر نہ ہوتے تو تم کو میں ضرور چوم لیتی۔ یہاں کے گلابوں کی ٹہنیاں بھی تو افریقنوں کے قدوں جیسی ہیں۔ لمبی لمبی اس (کدونا) میں اتنی تیز بارش اور ہوا چلتی ہے تم گھبراتے نہیں صرف لرز جاتے ہو تھوڑا سا...... اب کے اس طوفان سے بچ گئے تو خیر۔ اور یہاں کی سخت دھوپ اور بارش جب سورج تم سے کچھ ہی دور رہ جاتا ہے تو تمہاری تمازت کہاں نچڑ جاتی ہے...... میں تو ایئرکنڈیشن کمرے کے اس شیشے سے تم کو دیکھتی رہتی ہوں۔ شیشے کا ننگاپن مجھے اچھا لگتا ہے۔ اس پر پردہ میں اس وقت ڈالتی ہوں جب آسمان سے زمین تک بجلی کی کوند چند لمحوں میں سارے ہی کدونا کو روشن کر جاتی ہے۔

بجلی کی تڑپ، بے قراری کی شکلیں زندگی میں پہلی دفعہ افریقہ کی سرزمین میں دیکھی سرخ بجری کی مٹی میں سیاہ پہاڑوں کی اوٹ میں مچلتے ہوئے دیکھیں روح تک کانپ گئی۔ حضرت موسیٰ تو پیغمبر تھے۔ وہ تو بے ہوش ہوگئے۔ میں تو بس سکتے میں تھی۔ میرا چہرہ بھی موت کے خوف سے زرد ہو جاتا ہے۔ تم اس وقت تازی ہوا میں لہرا رہے ہو۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔

کدونا...... ایک خوب صورت ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں سات منزلوں کے ہوٹل میں بظاہر میں ایک معزز بیگم صاحبہ ہوں مگر قید میں ہوں۔ ویسے میں کوئی پیشہ ور نہیں۔ بغیر کسی حساب کتاب کے میرے اس خوبصورت حسین بٹوے کے اندر کچھ بھی نہیں اس ملک میں رسم ہے باہر سے آئے ہوئے لوگ ٹیکسی میں نہیں گھوم سکتے۔ ان کی اپنی پرائیویٹ گاڑیاں ہوتی ہیں۔

نہ میں کچھ خرچ کر سکتی ہوں نہ میں کہیں جا سکتی ہوں اس لیے اس فائیو اسٹار ہوٹل میں قید ہوں۔ ویسے میرے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ برقرار ہے۔ اس پورے شہر میں میرا کوئی بھی نہیں، سوائے ایک حسین غم کے جس کی آنچ میں ہمیشہ ہی جلتی ہوں۔ میرا بیٹا جو اس کا بیٹا بھی ہے۔ کیسے اس کو چھوڑ دوں۔ اس محبت کی عجیب قربانیاں ہیں۔ ابھی تین سال ایران میں گزار کر آئی۔ ایسے سخت امتحان سے گزری ہوں کے روح ابھی تک بے چین ہے۔ تین سال کے لڑکے کے ساتھ دیار غیر میں گزارنے پڑے پھر روٹی کپڑا بھی نوکری کرنی ہو تو ایک اکیلی عورت کو نانی یاد آ جاتی ہے۔ میرے ساتھ تمام عمر میرے دونوں بھائی میری تکلیفوں میں کام آتے رہے انہیں سکون نہیں ملا۔ غم میں سب میرے شریک رہے۔ ایران کے تین سال میں نے اکیلے نہیں گزارے میری ماں بھائی بھاوجیں بچے تک میرے ساتھ دکھ اٹھاتے رہے ہیں اب تو مجھ میں بھی سکت نہیں۔ اللہ میاں اس ملک میں تو مجھے سکون دیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا اب میں کیا کروں۔ چاروں طرف سیاہ براؤن پیلے ملگجے چہرے کلبلا رہے ہیں۔ میں کہاں آ گئی۔

ہمارا ہوٹل یا کدونا کی لائبریری ہے خدا کا شکر ہے۔ میری عید ہوگئی۔ میں پیدل نبیل کو اسکول کی بس پر چھوڑ کر لائبریری چلی جاتی۔ معید صاحب جو لائبریرین تھے کتنی تعریف ہر ایک سے کرتے، کیسی اچھی ماں ہے ہر دوسرے تیسرے دن اپنے بچے کے لیے ڈھیروں کہانیوں کی

کتابیں لے جاتی ہیں...... ہر ایک کی ماں ایسی ہی ہو...... ان کو کیا معلوم کہ ہم نے اپنے بچپن میں جو کہانیاں پھوپھی ممتازی سے سنیں ''عقل مند کوا''، ''انوکھا ہار'' اور اس طرح کی بہت سی کہانیاں پھول میں پڑھیں...... ان میں سے بہت سی انگریزی ادب کی چوری تھی۔ Mark Twain اور Hans Christian Anderson مشہور لکھنے والے تھے۔ ہکل بری کا کریکٹر کن کن ناموں سے اُردو میں روشناس کروایا گیا۔ اپنے گھر میں امیر حمزہ کی داستان سننے کے لیے ہر دوسرے تیسرے دن بڑیوں کا سالن زہر مار کرنا پڑتا تھا...... آنسو نکل جاتے تھے اور اماں کا اصرار ہوتا...... میرے بھائی سے کہتیں اس کا نخرہ میں ختم کراؤں گی...... ابھی مت پڑھو...... جب تک یہ بڑیوں کا سالن نہیں کھائیں گی یہ امیر حمزہ کی داستان نہیں سن سکیں گی اور اقبال بھائی باورچی خانے کی دہلیز پر بیٹھے چٹائی پر لمبی چوڑی امیر حمزہ کی داستان کھولے پڑھتے جاتے اور شب دیگ سے کوفتے نکال نکال کھاتے جاتے...... اماں گرم پھلکے ان کے آگے رکھتی جاتی۔ میں اس انتظار میں رہتی کہ جلدی سے کوفتے کا نوالہ اُترے گلے میں سے اور پتہ چلے کہ وہ اشرفیاں جو چمڑے کے تھیلے میں مٹی میں دبائی تھیں ملی یا نہیں اور وہ جلدی سے آدھے گرم پھلکے کا ایک نوالہ توڑتے جلدی جلدی نوالہ چباتے ہوئے دوسرا نوالہ بناتے اور میں جھاڑیوں میں کھڑے بادشاہ کا زرق برق لباس دیکھتی رہتی۔ کیسے اچھے دن تھے وہ آج بھی سوچتی ہوں تو دل اُداس ہوجاتا ہے...... پرسکون گھر سے باہر بنگال میں پھر سے ایک اور زبردست قحط آچکا تھا دن میں کئی لمبے لمبے جلوس نکلتے رہتے تھے۔ آنا دو، چاول دو، تم خود پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھاؤ آدھا ان کو بھی دو جو کئی دن سے بھوکے ہیں...... بنگالی لڑکیاں لڑکے گاتے ہوئے گزر جاتے...... ماما جی کے اسکول کی لمبی ساڑھی پکڑے دونوں طرف سے سڑک پر سے گزرتے جاتے تھے اور اپنے اپنے گھروں سے برآمدوں میں کھڑکیوں سے لوگ پیسے اکنی، دونی پھینکتے جاتے تھے۔

آج بنگالیوں کا جلوس پھر نکل رہا تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور کا گیت سارا جلوس گا رہا تھا۔

آسمان تو نے یہ ظلم کیوں کیا ساری خوبصورت زمینوں سے جوان لہراتے کھیت اکھاڑ

پھینکے کیوں؟ اور بھاگ بھاگ کر، میں اماں سے پیسے لے کر اوپر سے اُن کی جھولیوں میں پھینک رہی تھی۔ چوں کہ میرے پڑوسی کے دو لڑکے میرے دوست تھے۔ جن کو میں نے بھیا دُوج پر راکھی باندھی تھی۔ انہوں نے ایک دِن لڑائی میں کہا تھا کہ اللہ کرے تمہارا اللہ مر جائے اور میں نے بھی غصّے میں انہیں بنگالی میں جواب دیا تھا۔ اللہ کرے تمہارا سبھاش چندر بوس مر جائے۔ جو اُس زمانے میں جرمنی بھاگ گیا تھا۔ لڑائی کے زمانے میں۔ اور بی بی سی میں ایسی خبریں دینے والے انگریز انہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ روپوش ہو چکے تھے اُن کا جذبہ سچا تھا۔ وہ جرمنی میں نہیں رہنا چاہتے تھے۔ یہ مجھے ''گلا'' نے بنگالی میں جلدی جلدی غصّے میں بتایا تھا۔ بالکل ایسی ہی لڑائی اس وقت افریقہ میں ہو رہی تھی۔ مگر اب کے تو نائیجیریا کے ایبوز کی لڑائی ہے۔ یہاں ''بیافرا'' میں دو سو سیڑھے ساڑھے مسلمان مسجد میں نماز پڑھنے گئے اور دروازہ بند کر کے آگ لگا دی گئی۔ ''ہاؤسا'' اللہ کے گھر میں جل کر مر گئے سب کے سب۔ پاس ہی چرچ میں حضرت عیسیٰ سکون سے صلیب پر ٹنگے ہوئے تھے۔ اور بی بی سی پر کوئی خبر نہیں آئی...... مجھے اِن سب ڈھکوسلوں پر اُلجھن ہوتی ہے۔ میں نے اسی ''کدونہ'' میں، انہیں سرمئی سڑکوں پر اُس روز ''سردونا سکوٹو'' اور ''تفاوا بیلوا'' کو گولی لگے، قتل ہوئے دیکھا۔ ابھی ہندوستان پاکستان کے خون خرابے ذہن میں ویسے ہی تازہ تھے۔ اُن کا لاشہ پورے دن سڑک پر پڑا رہا۔ نائیجیریا کی تیز دھوپ میں اُسی سفید قبا میں جو وہ حج کر کے اُسی ہفتے نائیجیریا پہنچے تھے۔ اسی کالی چمکدار دھوپ میں تمتماتی سڑک پر لاشہ پڑا رہا۔ بے چادر ان کی لاش پڑی رہی اور لوگ ڈرتے رہے۔ دیکھتے رہے کہ اگر تھوڑی سی بھی لاش کو عزت بخشی تو اور کئی لاشیں نزدیک بکھری ہوں گی۔ چار بیویوں میں سے پہلی بیوی نے لپٹ کر گولیوں سے اپنا جسم چھلنی کروا ڈالا۔ وہ قربانی تو سب کو یاد رہے گی۔ پہلی بیوی میاں کے آگے آ کر جان بچانے آ گئی اور اُس کا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ افریقہ کی اِس عورت کی عظمت نے مجھے جھنجھوڑ دیا تھا۔ جلوس میں شرکت کرنے کا اب کوئی بھوت سوار نہیں ہوتا۔ کون سا ملک ایسا ہے جہاں مذہب، زبان، ذہن پر لاکھوں قتل نہیں کر دیے جاتے۔ معصوم بچوں اور عورتوں کی بے حرمتی نہیں ہوتی۔ ان افریقن کی سیاہ کھال سہی مگر مذہب کی تفریق نے زندگیاں عذاب کر دیں۔ ہندوستان، پاکستان سے آئے ہوئے مسلمان

تک ذرے بیٹھے تھے اپنے اپنے گھروں میں۔ میرا نوکر ''اینٹنی'' کرسچن تھا۔ دوسال سے کام کرتا تھا۔ کدونا کے جتنے اسٹورڈ تھے سب اتوار کو چھٹی لے کر گرجا جاتے۔ وہاں ان کو ٹافی کیک کپڑے مفت ملتے۔ سارے کرسچن گرجوں میں بھرے ہوتے۔ گھروں کے نوکر صبح دس بجے سے ایک بجے تک وہیں رہتے۔ گرجا سے آ کر کام کرتے۔ میرا پہلا نوکر ذاکر تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کئی بار میں نے اس سے پوچھا تم ضرور مسلمان ہو تمہارا نام ذاکر ہے وہ جواب دیتا میں کرسچن ہوں میں مسلمان نہیں۔ ہر اتوار وہ گرجا جاتا آخر ایک روز نہ جانے میرے سلوک سے یا اعتماد کرنے پر اُس نے بتادیا کہ اس کے باپ نے ۱۰ پاؤنڈ میں اس کو بچپن میں فلاں چرچ میں بیچ دیا۔ میں کرسچینٹی پر بلیو کرتا ہوں۔

''بٹورا''

وہ لسی بیچنے والی ''فلانی'' نسل کی عورت جو بالکل ہی انگریزی نہیں جانتی تھی، بگڑی ہوئی عربی ''ہاؤسا'' مسلمانوں کی زبان جانتی تھی۔ میں اپنے اینٹنی نوکر سے پوچھ پوچھ کر ٹوٹی پھوٹی بات کر لیتی تھی۔ ایک روز وہ کمرے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی سیاہ چمکدار لمبی گردن میں پڑے ہوئے نیلے دھاگے اُس کی گردن کی اُبھری ہڈیوں میں پڑے مچل رہے تھے تیزی سے سانس لیتے ہوئے وہ ہنس رہی تھی۔ ''بٹورا'' ''بٹورا''۔ ''سنو'' وہ گردن جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے paper mache کے آدھے گھڑے ہیں لسی میں تیرتے ہوئے مکھن کے ڈلے میرے ہاتھ میں تھے ''چار ہی لوں گی۔''

میں نے اشارے سے اُسے بتایا۔ میں مکھن لے کر اس کا گھی نکالتی ہوں۔ جو پراٹھوں میں کام آتا ہے۔ اینٹنی نے ہنسنا شروع کر دیا۔

نو میڈم...... ماسٹر کو اس نے کمرے میں دیکھا ہے۔ یہ کچھ کہہ رہی ہے اس کو جانے دیں دوسری کل لے آؤں گا وہ جلدی جلدی گھبراہٹ میں کہہ رہا تھا اس سے مت لیں یہ خراب ہے۔ نہیں، کیا خراب ہے؟ نہیں! میرے پاس مکھن نہیں ہے آج لینے میں کیا ہوا میں حیرت سے اینٹنی اور اس فلانی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ چیخی۔ ''بٹورا''۔ پھر کچھ ہاؤسا میں کہہ رہی تھی۔ اینٹنی

نے اُسے زبردستی پکڑ کر نکالا۔

آخر کیا ہوا۔ نوکر ہو میرا کہنا کیوں نہیں مانتے۔ مجھے ابھی اس وقت مکھن چاہیے۔ میں لاتا ہوں...... وہ اُس عورت کو پکڑ کر باہر لایا، مکھن میرے ہاتھ سے لے گیا......

آخر کیا ہوا بڑا خودسر ہوگیا ہے۔ سر پر چڑھ گیا۔

پورا دن میں اُس سے نہیں بولی۔ ''بوُرا'' کیا ہوتا ہے۔ وہ استری کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ آنکھیں نیچے کیے۔ ماسٹر نبیل کی طرح کا بچہ چاہیے تھا اس کو۔ ماسٹر کو اس نے آتے ہوئے دیکھا۔ بوُرا کیا؟ میں نے پھر اس کی ضد سے تنگ آ کر کہا۔ فورنز کو بوُرا کہتے ہیں۔ اللہ کی شان ہم فورنز کہلائے کالوں کے ملک میں ہم بھی تو پاکستانی کالے ہی ہیں۔

نہیں میڈم آپ لوگ یلوئش ہیں...... یہاں کی عورتیں اچھی شکل کے بچے پسند کرتی ہیں چاہے باپ کوئی ہو۔ وہ آپ سے یہی کہہ رہی تھی اس لیے میں نے نکال دیا۔ اب وہ یہاں نہیں آئے گی۔ مکھن صبح سے شام تک بیچتے پھرتی ہیں کوئی اور آ جائے گی......

دس گیارہ سال کے انٹنی نے ایک معمر آدمی کا روپ دھار لیا اور میں سوچنے لگی یہ تو کبھی نہیں سنا تھا...... بہن بہن کھیلتے سنا تھا ڈوپٹہ بدل سنا تھا۔ اپنے میاں کا ایک عدد بچہ کسی نے اسے مانگتے نہیں سنا۔ یہاں کی عورت کتنی آزاد ہے اور کتنی مظلوم ہے۔ اصل میں عورت اپنی قدر کرانا ہی نہیں جانتی۔ یہی اکثر سوچتی۔ ڈبل روٹی خریدنے جب ہم جاتے اندھیری سڑکوں پر چھوٹی چھوٹی میزوں پر ڈبل روٹی کے ڈھیر لگائے خواتین تجارت کرتیں۔ مجھے کسی نے بتایا یہ کالے پیلے رینگتے ہوئے بچے منسٹروں کے ہیں۔ جس کو بھی وہ نواز دیں یہ تو اس کی اپنی قسمت ہے۔ رئیسوں کے بچے سہی۔

ویسے نائیجیریا کی عورتیں جو ''ہاؤسا'' نہیں۔ ایبو، یوربا، پیکن، فلانی، کافی آزاد ہوتی ہیں۔ اپنی روٹی خود کماتی ہیں مختلف طریقوں سے جن میں اتنی برائیاں نہیں ہوتیں۔ میری پہنچ تو بڑی پارٹیوں سے لے کر گھر کے چاروں طرف محدود تھی۔ گھر کے باہر سودا بیچنے والیاں آجاتی اور میں ''اینٹی'' اپنے اسٹورڈ کی مدد سے زبان سمجھنے کی کوشش کرتی رہتی۔ اگر کوئی بھی مدد نہ کرے تو اشاروں سے بھی کام چل جاتا۔ دو عورتیں میرے فلیٹ میں برابر آتی۔ ایک نونو بیچنے

والی یعنی لسی بیچنے والی جو گھی بیچتی تھی اور مکھن سے میں گھی گرم کر کے بناتی تھی۔ نبیل کے باپ کو پراٹھے پسند تھے۔ اینٹنی کو پراٹھے پکانے آ گئے تھے۔ شامی کباب کا نام بھی لینا آ گیا تھا۔ وہ نبیل سے انگریزی میں ہی بات چیت کرتا تھا۔ نبیل کو پاپا پی پی اور اسکول میں پاکستانی بچے بھی مل گئے تھے۔ مسز علوی کے بچوں کی کلاس میں تھا بہت خوش تھا اس کی تو عید تھی۔ اسکول سے آ کر کھانا کھا کر باپ کے ساتھ سو جاتا اٹھ کر ہوم ورک کرتا، گرم گرم مونگ پھلیاں اینٹنی oven میں بناتا اور وہ کٹورے بھر بھر کے مونگ پھلیاں کھاتے رہتے۔ میں شام کی چائے کے بعد فلیٹ کے پاس کے علاقے میں اکیلی سیر کو چلی جاتی تھی۔ شام بہت اداس ہوتی۔ پانچ چھ بجے کے بعد پاکستانی ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے رہتے مگر نبیل کے باپ کو کسی سے ملنے کی تمنا ہی نہیں تھی۔ وہ دونوں آپس میں خوش تھے شام کو نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں ساری شام کھلے میدانوں میں نزدیک نزدیک چلی جاتی اندھیرے سے پہلے گھر آ جاتی کے کہیں سانپ نہ نکل آئیں۔ شام کو اکثر پاکستانی فیملی میرے پاس آ جاتی اور مجھے تقویت ملتی کے میں بھی زندہ ہوں۔ کبھی پکوڑیاں بنا کر رکھ دیتی یا پاپڑ تل دیتی اکثر لوگ چائے کی اس محنت سے بچنے کے لیے آ جاتے مجھ سے ملنے۔

فاٹی

کل ساری رات نہیں سوئی۔ نمبر تین فلیٹ میں اُوپر ایک یوربا افریقن فیملی رہتی تھی۔ ٹیچر بیوی۔ ایک چھوٹی بچی کو نوکرانی کمر پر باندھے اُس کے ساتھ روز کار میں بیٹھ کر جاتی۔ میں دیکھتی تھی۔ آتے جاتے ہیلو ہیلو ہو جاتی تھی۔ نوکرانی کا نام فاٹی تھا۔ گیارہ بارہ سال کی موٹی سی لڑکی اپنی مالکن کے ساتھ اسکول جاتی گھر میں کھانا پکاتی کپڑے دھوتی صفائی کرتی گھر کا سارا کام کرتی۔ کپڑے سکھانے جب کبھی کبھی نیچے آتی تو گھاس پر ریلنگ میرے باورچی خانے کے بڑے قریب تھی۔ ڈر کے مارے بات بہت کم کرتی اور اوپر دیکھتی رہتی بے چاری بڑی مظلوم سی لڑکی تھی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنا کام کرتی ہے میں اکثر سوچتی۔ کبھی کبھی وہ پٹتی بھی تھی۔ میں گھبرا جاتی کیسے اُس کو بچاؤں۔ رات کے اندھیرے میں سسکیاں کھو جاتیں اور نمبر ۳ کے ٹیلی

ویژن کی آوازیں تیز ہو جاتیں۔ ایک دوپہر اتوار کو وہ روتی ہوئی نیچے زینے سے اتر رہی تھی۔ ہاتھوں پیروں پہ چوٹوں کے نشان تھے۔ جیسے بھاگ کر آئی ہو کوئی پیچھا کر رہا ہو میرے کچن کا دروازہ کھلا ہوا تھا وہ اندر آ گئی۔ پھر کیا ہوا میں بالکل بھول گئی کہ یہ پاکستان نہیں یہ نائیجیریا ہے مجھے محلے کے کسی معاملے میں نہیں بولنا چاہیے بہت بُری بات ہے۔ مجھے کئی دفعہ ڈانٹ پڑ چکی تھی اس بات پر مگر میں تو جیسے پاگل ہو گئی۔ تمہاری میڈم کہاں ہیں۔ کیوں تمہیں مارتی رہتی ہے میں نے پیار سے اُسے سہارا دیا۔ وہ بچی ہی تو تھی پھوٹ پڑی۔ میڈم گئی ہیں ولیج، صاحب ہے، مجھے مارتا ہے۔ بہت غصّے ہوتا ہے۔ میں اُوپر نہیں جاؤں گی۔ وہ رک رک کے روتے ہوئے مجھے بتا رہی تھی۔ دروازہ بند کر دیں میں رات کو اُوپر نہیں جاؤں گی وہ دروازے کے پیچھے چھپ گئی۔ میڈم کل صبح آئے گی کیا میں رات کو یہاں رہ سکتی ہوں۔ میں چل نہیں سکتی اُس کی ٹانگوں پر نیل، کالی سیاہ کھال پر چکتوں کی شکل میں نظر آ رہے تھے۔

فاٹی تم مجھ سے چھپا رہی ہو کیا ہوا بتاؤ۔ تم اکثر پٹتی ہو۔ کئی دفعہ میں نے تمہارے رونے کی آواز سنی۔ وہ تو میڈم نے مارا تھا مجھے، استری سے کپڑا جل گیا تھا۔ تمہارا پورا نام کیا ہے میں نے اپنا پورا شک اُس پر ظاہر کیا۔ میرا نام فاٹما ہے میرا گاؤں یہاں سے تیسرا گاؤں ہے میری ماں نے میڈم کے ہاتھ مجھے بیچ دیا تھا۔ میں اب کہیں نہیں جا سکتی۔ فاطمہ تم بھی مسلمان ہو۔ میں جیسے دہل گئی۔ نو نو آئی ایم کرسچین میرا نام فاٹیما ہے میری ماں نے میڈم کو بارہ پاؤنڈز میں بیچ دیا تھا۔ میں بہت چھوٹی تھی۔ میں کرسچین ہوں۔ میں کہیں اور نوکری بھی نہیں کر سکتی سوائے میڈم کے، وہ ہلکے ہلکے بول رہی تھی۔ گاؤں میں میری ماں ہے وہ کبھی آ کر مل جاتی ہے۔ بہت سے بھائی بہن ہیں۔ میڈم ٹھیک ہیں صاحب مجھے تنگ کرتا ہے۔ میڈم کو پتہ لگے گا تو وہ مجھے اور مارے گی اور یہ مجھے اور پٹوائے گا جھوٹ بول کر۔ وہ زور سے رونے لگی۔

فرانسس ڈرائیور

کل پھر نہیں سو پائی۔ نمبر ۴ کا ڈرائیور جب سے ہمارے گھر میں بھاگ کر آیا تھا...... ہاؤسا فوجیوں نے اس کا پیچھا ڈرائنگ روم تک کیا...... ڈرائنگ روم کا دروازہ بند تھا وہ باہر نہیں

نکل سکا...... یہ میری احتیاط، ہر وقت ڈرائنگ روم کا دروازہ بند رکھنا...... مہمان آئیں تو کھولو
آخر رکھا ہی کیا ہے یہاں کے کمروں میں چور کیا لے جائے گا۔ پہلی دفعہ اپنی احتیاط پر مجھے غصہ
آیا...... ملامت، اگر دروازہ کھلا ہوتا تو فرانس اس دروازے سے باہر بھاگ جاتا...... غریب
پکڑا نہ جاتا اب تو فوجی اس کو نہ جانے کتنا ماریں...... وہ ایبو ہے...... سارا کدونا ڈھونڈ ڈھونڈ کر
ایبو پکڑ رہے ہیں...... جب سے ''اینگو'' میں مسجد کا دروازہ بند کر کے باہر سے سارے ''ہاؤسا''
کو جلا دیا۔

اینگوا ایبوز کا شہر ہے۔ اب ہاؤسا ڈھونڈ ڈھونڈ کر مار رہے ہیں ایبوز کو۔ روپے جمع کر کے
بھیج رہے ہیں تاکہ اسلحہ خریدا جائے۔ یہ افواہیں بڑے زور و شور سے پھیل رہی تھیں...... اور
فرانس کے پاس پروف تھا۔ یہ پیسے میری طرف پھینک رہا تھا کہ فوجی اس کے پیچھے آ گئے۔
میڈم یہ میرے بچوں کے لیے ہیں پیسے اور میں رات گیارہ بجے اپنے باورچی خانے میں برتن
رکھ رہی تھی...... دروازہ کھلا تھا...... فرانس کا خیال تھا وہ میرے باورچی خانے سے ڈرائنگ روم
کے دروازے سے دوسری طرف نکل جائے گا...... مگر میں تو تالا لگا چکی تھی اور اس کے قتل کا
سامان تیار تھا...... کیسے مارتے ہوئے وہ اسے لے گئے...... اب آج سے وہ میرے اسٹورڈ
انتھنی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ انتھنی غائب ہے...... نبیل پریشان...... اسکول سے آ کر کھانا نہیں
کھایا...... کیسے بتاؤں...... کسی کو نہیں بتاؤں گی انتھنی کو میں نے ایک سال اپنے بچے کی طرح رکھا
اس کو چپاتی پکانی سکھائی، کباب بنانے سکھائے وہ نبیل کا دوست ہے۔ چھوٹے چھوٹے اردو کے
لفظ وہ بولتا رہتا ہے ہمارے گھر کا دوسرا بچہ ہے۔ چاہے وہ کرسچن ہے تو کیا...... انتھنی انسان
ہے۔ بچوں کی طرح اس گھر میں میرے ساتھ ایک سال سے رہ رہا ہے۔ ایسا شریف بچہ ہے
میں اس کو کیسے موت کے منہ میں دھکیل دوں۔ نبیل کے باپ کو اپنی نوکری عزیز ہے۔ دنیا میں
نوکری اور پیسہ یہی قیمتی چیزیں ان کو دنیا میں معلوم ہیں۔ کئی دفعہ مجھے دھمکیاں دی جا چکی ہیں۔
میری بری عادت ہے جلدی سے کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی، جھوٹ کے لیے مجھے پلان کرنا پڑتا
ہے...... اللہ نے کہا ہے کہ کسی کی جان بچانے کے لیے جھوٹ بول سکتے ہیں۔ میں ہمیشہ اس وجہ
سے پکڑی جاتی ہوں۔ میری خاموشی میں اگر جھوٹ شامل ہو جاتے تو مجھے مصیبت لگتی ہے اللہ ہی

میری مدد کرے گا۔ دس پونڈ بھی اس کے کرائے کے لیے بچالیے ہیں یہ دلیل کام کرے گی کیوں کہ اس میں جھوٹ نہیں شامل...... ہاؤسا کا کرتا بھی میں نے نبیل کا اس کے لیے رکھ دیا یہ بھی جھوٹ نہیں اس کو بھی میں اعتماد سے کہہ سکتی ہوں ...... باقی میں کسی طرف نگاہ نہیں اٹھاؤں گی کیوں کہ میری آنکھیں جھوٹ نہیں بولتی ہیں۔

سیاہ بھاری بھاری جوتوں کو کیسے تھام لیتی جو پرانی پھٹی پتلون میں کانپتی ہوئی ٹانگوں کو کچھ دیر کچلنا بند کر دیتا فوجی۔ یہ میں چیخنا چاہتی تھی کہ یہ پیسے اس کے اپنے ہیں...... دیکھو اس کا کاغذ کھول کر...... اس میں اس کی مدت چھپی ہے۔ انگلیوں کی احتیاط...... حفاظت کی نشانیاں ہیں...... اس کاغذ کی شکنیں دیکھو...... اس کو مت مارو...... اس میں کئی مہینوں کی اس کی تنخواہ سے بچائی ہوئی رقم اس کے بچوں کے لیے ہے جو وہ ہر دفعہ کسی آنے جانے والے کے ہاتھ بھیجتا ہے۔ میرے سامنے وہ اس وقت افریقن نہیں تھا ''ایبو'' نہیں تھا ''ہاؤسا'' نہیں تھا ''یوروربا'' نہیں تھا پاکستانی مسلمان نہیں تھا...... اس وقت میں اور وہ ایک انسان تھے۔ اس کے چہرے پر موت کا خوف تھا...... منہ سے خون بہہ رہا تھا...... جانا بوجھا سرخ سرخ خون اور ایسا ہی خون میں نے اپنی سرحدوں پر بہتا دیکھا...... سرمئی اور ہری وردیوں پر بہتا رہا...... ایسے میرے ملک کی سڑکوں پر خوفزدہ ہواؤں میں زرد کملائے چہرے درختوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے جن سے پتوں کی سرسراہٹ موت کو چوکنا کر دیتی تھی...... ایسی ہی سرمئی سڑکوں پر جسم کے ٹکڑوں سے بہتا ہوا خون میں نے کچھ سالوں پہلے دیکھا تھا۔ وہ خون میرے جسم میں پھیل رہا ہے ایسا ہی موت کا خوف میں ان سیاہ ملگجے چہروں پر بکھرا دیکھ چکی ہوں...... جب میں ہندوستان چھوڑ کر پاکستان آ رہی تھی۔ اس وقت سے اب تک کتنے ہی ملکوں میں مذہبوں کی خاطر، مادری زبان کی خاطر، مندروں، مسجدوں اور گرجا گھروں کی خاطر سڑکوں پر بہتے ہوئے ایسے ہی خون دیکھتی چلی آ رہی ہوں...... نمبر ۴ کے سہمے ہوئے ڈرائیور فرانسس کی سیاہ آبنوسی شکل کو میں نے کیسے زرد کپڑے میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا۔ جب فوجیوں کے ایک مکے سے اس کے منہ سے خون بہنا شروع ہوا تھا...... کیا موت کے خوف کا ہر ملک میں ایک ہی رنگ ہوتا ہے۔

اینتھنی
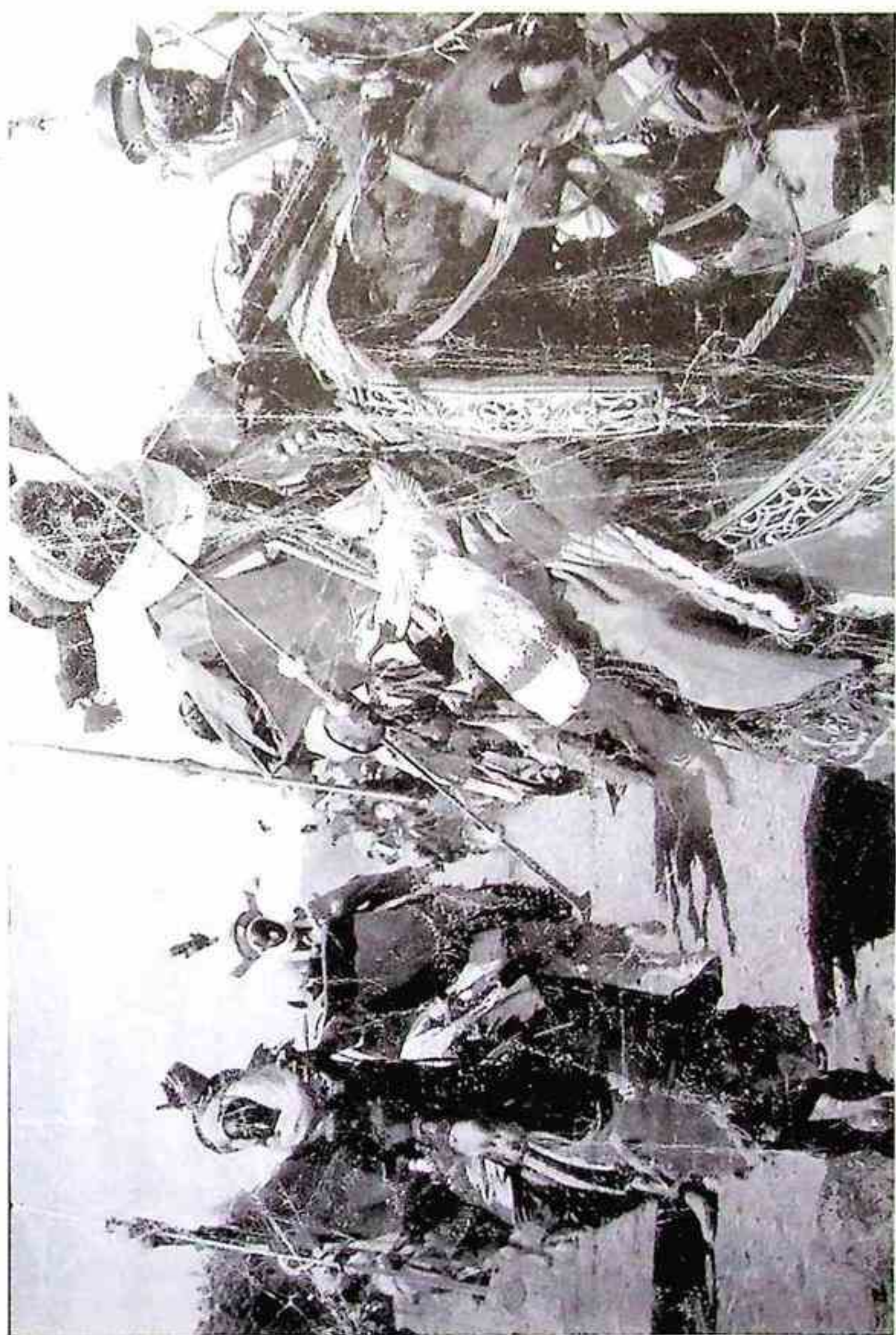
آج اینتھنی کو مجھے چھپائے ہوئے دو روز ہو چکے ہیں۔ بہت سے فوجی باہر سے پوچھ کر جا چکے ہیں۔ نبیل کے باپ نے بھی گاردی صاحب سے کہا انہوں نے اور ڈاکٹر نے سمجھایا کہ اینتھنی کو اپنے گھر سے نکال دو ورنہ گل کی نوکری جائے گی۔ یہ میرے سامنے بڑا سخت امتحان تھا۔ ایک سولہ سال کے بچے کی زندگی یا نبیل کے باپ کی نوکری۔

وقت بہت آہستہ آہستہ سسک رہا ہے۔ اینتھنی کا چہرہ آج تین روز سے پلنگ کے نیچے لیٹے لیٹے کالے رنگ سے ملگجلے، پیلے زرد پھیکے رنگوں کے دھبوں کا بادامی رنگ کا ہوتا جا رہا تھا۔ کھانا چھوڑ دیا تھا ذرا سی آہٹ پر گھبرا جاتا۔ ماسٹر اور میڈم کی لڑائی سے خوف زدہ تھا۔ اُس کو معلوم تھا کہ ماسٹر بہت سخت طبیعت کا ہے نہ جانے اُسے کب پلنگ سے کھینچ کر دونوں ٹانگیں پکڑ ''ہاؤسا'' کو پکڑا دے۔ اُس کو اپنی نوکری بہت پیاری ہے وہ نائیجیریا کبھی نہیں چھوڑ کر جائے گا۔ میڈم ایک رحم دل ماں کا دل رکھتی ہے وہ تو موقع کی تلاش میں تھا کہ رات کو موقع ملے تو نکل بھاگے۔ ''اُنوگو'' چلا جائے گا اپنی ماں کے پاس۔ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا کدونا میں ''ہاؤسا'' مسلمانوں کے شہر میں۔ کئی راتوں سے نہیں سویا تھا ماں کا چہرہ اُس کے ساتھ تھا...... ویسے Jesus اُس کے ساتھ ہی تھا۔ اُسے یقین تھا کہ جلدی کوئی راہ نکل آئے گی اور وہ اِس گھر سے بھاگ جائے گا۔ آخر یہ بھی مسلمانوں کا گھر ہے مگر میڈم کی وجہ سے اُسے تسلی تھی وہ اُسے کبھی ''ہاؤسا'' کے سپاہیوں کے ہاتھ نہیں دے گی وہ دیکھ چکا تھا۔ پلنگ کے نیچے لیٹے لیٹے سن سکتا تھا فوجیوں کے قدموں کی آوازیں سن کر کانپ رہا تھا وہ پلنگ کے نیچے سوٹ کیسوں کے پیچھے لیٹا ہوا تھا......

پلنگ کے باہر جھانکتے ہوئے سوٹ کیس کبھی بھی نہیں بتا سکتے تھے کہ اِن کے پیچھے چھپا ہوا سولہ سالہ کرسچین لڑکا اپنی جان چھپائے اِس پناہ گاہ میں تھا۔ خود اِس گھر کے ماسٹر کو بھی پتا نہیں تھا۔ وہ گھبرا جاتا جب ماسٹر میڈم کو اپنی زبان میں ڈانٹتا۔ اُسے یہ خوف گھیرے رہتا کہ کہیں میڈم ڈر کر نہ بتا دے میرا پتہ۔ اب کے وہ تو مجھے فوراً پکڑ کر فوج کو دے دے گا اُس نے ''فرانسس'' ڈرائیور کا حشر اُس رات خود دیکھ لیا تھا۔ نمبر ۴ اوپر والے انگریز کا ڈرائیور فرانسس کو

کیسے جوتے اور تھپڑ مار کر سیڑھیوں سے گراتے لائے تھے اور اُسے خون میں لت پت کر دیا تھا۔ اُس نے چیختے ہوئے میڈم سے پناہ مانگی تھی۔ کچن کا دروازہ کھلا ہوا تھا وہ اندر آ گیا تھا بھاگ کر۔ میڈم کچھ بھی نہ کر سکی۔ ''ہاؤسا'' فوجی اُس کے باورچی خانے سے زخمی فرانسس کو کیسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے تھے۔ ماسٹر نے میڈم کو رات بھر اپنی زبان میں کیا کچھ کہا تھا اور وہ روتے رہے تھے اور میڈم نے اُسی رات مجھے اس پلنگ کے نیچے چھپا دیا تھا اور میڈم کہہ رہی تھیں کہ اب کے اُس کی باری ہے۔ فوجیوں کو پتہ لگ گیا ہے کہ تم بھی کرسچین ہو میڈم نے چپکے سے انگریزی میں پرئیر بھی مجھے یاد کرائی تھی، مسلم پرئیر۔ یہ یاد کرنے سے ''ہاؤسا'' مجھے مسلم سمجھ لیں گے۔ میڈم کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی وہ سب مجھے جانتے ہیں کہ میں مسلم نہیں گولی ماردیں گے اُسی وقت مسلم پرئیر سننے سے پہلے ہی۔ میں کرسچین ہوں میں کرسچین مروں گا وہ نہ جانے کیسے کہہ گیا اتنی کائینڈ میڈم کے سامنے بے چاری وہ بھی مصیبت میں ہیں آج رات میں ضرور بھاگ جاؤں گا۔ ابھی ابھی وہ مسلم پرئیر، ''ہاؤسا'' کا کرتا، ۱۰ پاؤنڈ اور گھڑی یہ سب میڈم کے دیئے ہوئے اُس کے پاس پڑے تھے۔ دو آج رات چپکے سے نکل جائے گا۔ ''کدونا اور انگو'' کے راستے میں لمبے شہتیروں جیسے درخت پٹے پڑے ہیں۔ باجرے کی بالیں اِس کے قد سے بھی لمبی لمبی ہیں۔ پھر اُس میں سبز رنگ کے سانپ اُن کی ٹہنیوں میں لپٹے رہتے ہیں اور گیلی زمین جس میں پاؤں دھنس دھنس جائیں کیسے میں بھاگ بھاگ کر رات گزاروں گا۔ اُس کا گلا پیاس سے خشک ہو رہا تھا۔ سامنے توس اور انڈے رکھے ہوئے سوکھ چکے تھے ماسٹر بھی نہ جانے کب گھر سے جائے گا کہ وہ نکل بھاگے۔

میں تم کو یہ دعا سکھا رہی ہوں یہ انگریزی میں بھی لکھی ہے تم میرے سامنے پڑھو۔ اگر کوئی ہاؤسا ملے تو اس کو منہ زبانی سنا دینا پھر وہ تم کو مسلمان سمجھیں گے اور اللہ نے چاہا تو تم کو چھوڑ دیں گے۔ میڈم میں کرسچین ہوں ویسے ہی میری موت لکھی ہے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں نے غصے کو نگلتے ہوئے کہا۔ تم کو مرنا ہے تو اپنی ماں کے سامنے جا کر مرنا...... میں تم کو یہ کلمہ سکھا کر بھیج رہی ہوں۔ تم کو معلوم ہے ماسٹر کا غصہ۔ میں تو چلی جاؤں گی جلدی اس شہر سے اینٹنی تم میرے بیٹے کی طرح ہو۔ میں اپنے سامنے تم کو قتل ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ تم اس

اندھیرے میں یہ ہاؤسا کی ٹوپی پہنو یہ چغہ ہاؤسا کے پہننے کا ہے۔ یہ ۱۰ پاؤنڈ گھڑی لو اور چپکے سے اندھیرے میں اس جنگل میں سے نکل جاؤ...... جاؤ جاؤ تم جلدی سے کدونا سے جلدی بھاگ جاؤ خدا تمہاری حفاظت کرے گا۔

دل تو میرا اُداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

کانٹا گورا

یہ نائیجیریا بھی عجیب جگہ ہے اُداس پہاڑ چاروں طرف پھیلے ہوئے، ہری ہری گھانس سے بھرے پُرے میدان اور ان میں چلتے پھرتے کالے نیلے براؤن بنولے کیچوؤں کی طرح کے انسان کلبلاتے کیڑوں کی طرح کے انسان، ننگے دھڑنگے۔ اتنے ننگے کہ نبیل بھی کہتا ہے ماما Shame Shame۔ اُس نے اتنے ننگے جسم کہاں دیکھے تھے یا کپڑوں کے تھان کے تھان لپٹے مرد حضرات جو بڑے مہذب قبیلے کے رؤسا ہیں۔ کئی کئی گز کے تھان اپنے چاروں قبا کی شکلوں پہنے اوڑھے۔ عورتوں کے چہروں پر کالی لکیروں کے نقش و نگار مختلف قبیلوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اُبھرتی ہوئی بچیوں کی عمر گیارہ بارہ سے شروع ہوجاتی۔ وہ گول تھالیوں میں کھوپرے کے ٹکڑے سجائے امرود کی ڈھیریاں بنائے بیچتی پھرتی۔ صبح سے دوپہر تنہا کھیتوں میں درختوں کے نیچے گاؤں میں سُرخ کاغذ سے چہرے رنگے ایسی بجی پھرتی۔ پھر کچھ مہینوں کے بعد وہ دوسری منزل کی طرف آجاتی۔ لسی بیچتی ہوئی جس کو وہ نونوز کہتے اس میں باجرے کے آٹے کے لڈو پڑے ہوئے یہ نائیجریا کی خاص خوراک تھی۔ بھنڈیوں کا کچومر نکال کر موسلوں سے کئی سیاہ دوشیزائیں کہیں بھی مارکیٹ بنالیتیں۔ جہاں دو تین لیلائیں مل بیٹھتی وہیں مٹی کے گھڑوں سے بازار سج جاتا۔ لوگ مٹی کے پیالوں میں لسی اور باجرے کے آٹے کے لڈو ملا مل غوبہ خریدنے بیٹھ جاتے۔ بیگنی فالسائی سیاہی رنگ کی لیلائیں تیرہ چودہ برس تک بڑی ہر دل عزیز رہتی ہیں۔ فلانی ذات بڑی خوبصورت ہوتی۔ مجھے اتنی لمبی لمبی گردنیں بڑی مرعوب کرتی عرب نسل کی ملاوٹ تھی۔

بڑی ہر دل عزیز رہتی ہیں'' فلانی'' ذات کی عورتیں کافی حد تک خوبصورت ہوتی ہیں۔ سیاہی کے رنگ اس میں چمک لمبی لمبی گردنیں آبنوسی پتھر کی سختی لیے جسم ایسی دلنوازی اور قدموں کی لمبائی جو ناپی ہی نہیں جاتی ان کا غرور بھرا قدم اُٹھانا، جیسے ساری دنیا کو اپنے پیروں تلے دباتی چل رہی ہو۔ چاہے کاندھے پہ درختوں کی ٹہنیاں ہی اٹھائے جا رہی ہوں۔ درختوں کے تنے کاٹ کر ان کو اندر سے کھوکھلے کر کے کشتی بنالیتی۔ اس میں جھاڑیاں، درخت کی ٹہنیاں، لسی کے مٹکے رکھے نیلے شفاف سے دریا میں سادے سے لکڑی کے ٹکڑوں کو چپو بنائے ڈوبتے سورج کی طرف نکل جاتیں۔ کالے کالے لمبے سائے پانی کی لہروں میں جاگتے مٹتے جاتے۔ نہ کبھی ان کو ہنستے ہوئے دیکھا نہ اداس۔ چہرے پہ خاموشی۔ آنکھوں میں دریا کی چمک چھپاتے شام کے سایوں میں کھوکھلے تنوں میں بہتی چلی جاتی دریا کے اس پار۔'' فلانی'' نسل سنا ہے عربوں کے سیاہ خون سے کھینچی ہے۔ حبش کی عورتیں شاید ان کے آبنوسی جسم جیسے پیرس کے ''لیڈو'' میں ''اسٹونی فگر'' کہلاتیں تھی جو ہم نے تین سال پہلے گیارہ فرنک میں جوس پینے کے بہانے دیکھے تھے۔ مگر وہ سرخ و سفید گوشت پوست کی تھیں۔ پتلی دبلی جسم کی عورتیں۔ جنہیں حسن کا پیکر کہا جاتا تھا اور یہاں'' کدونا'' کے'' جوش'' کانوں کے چپے چپے پر'' اسٹونی فگر'' بکھری پڑی ہیں۔ سُورت کے ایک بوری صاحب سرور میں اپنی بھونڈی شکل کو بھولے ہوئے بڑے چہک رہے تھے۔ نائیجیریا میں کھانا بہت سستا اور لڑکیاں ایک بسکٹ کے پیکٹ میں خریدلو۔

عورت کی اتنی توہین کسی اور ملک میں نظر نہیں آتی۔ یہاں کی دوسری زبان انگریزی ہے۔ دس بارہ قبیلے ہیں جن کی مختلف زبانیں ہیں۔'' ہاؤسا'' یہ مسلمانوں کی زبان ہے بگڑی ہوئی عربی جو نہ جانے عربوں کی سمجھ میں آتی ہے یا نہیں ویسے قرآن کی زبان تو سارے مسلمانوں کی زبان ہے۔ مختلف قبیلوں کے رسم و رواج بھی بڑے مختلف ہیں۔ عورتوں کے چہروں کے نیلے گدے ہوئے لکیروں کے نشان بھی ٹرائب کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مجھے'' ہاؤسا'' عورتیں اور ''یوروبا'' کے نشان معلوم ہوگئے تھے۔'' ایبو'' قبیلے کی عورتیں بہت تیز عموماً پڑھی لکھی ہوتی تھیں وہ شروع سے ہی اپنے محلے کے گرجوں میں مفت کلاسوں میں پڑھتی رہی، پھر گھروں، دفتروں اور اسٹوروں میں سیلز اسٹنٹ ہوجاتی۔'' یوربا'' عورتیں اکثر تجارتی ہوتیں۔ ان کی دکانیں کپڑوں

سے بھری ہر مارکیٹ میں ہوتیں۔ سبزیاں مصالحے پھل مچھلیاں بیچتی نظر آتیں۔ کڑھائی کی مشینوں پر نوجوان لڑکیاں، بڑی عمر کی عورتیں مرد بھی دکانیں کھولے بیٹھے رہتے۔

پارٹیوں، دعوتوں وغیرہ میں نائیجیرین خواتین بہت کم بات کرتی اور بات بتاتے ہوئے ہچکچاتی۔ امریکن انگریز ڈپلومیٹ کے گروپ میں تو اندازہ ہوجاتا۔ سب ایک دوسرے کے رسم و رواج سے واقف ہوتے۔ اخباروں، رسالوں میں سب ہی پڑھتے آئے ہیں۔'' کانٹا گورا'' ایک چھوٹے سے قصبے میں جانے کی بہت کم لوگوں کو اجازت تھی خاص طور پر فوٹوگرافر کو منع تھا۔

پاکستان اور ہندوستان ایوننگ میں اُس شام مجھے مسز بریگیڈیئر اوبرائے نے بتایا تھا ارے تم '' کانٹا گورا'' نہیں گئی۔ وہاں جانے کی بڑی مشکل سے اجازت ملتی تھی۔ یہ ابھی تک افریقہ کا قصبہ سہی طور پر افریقن لگتا ہے۔ Pagan وہاں کے رہنے والے پرانے قبیلے کے لوگ ہیں عورتیں صرف ایک دو پتے باندھتی ہیں۔ باقی برائے نام ...... مرد بھی پروں سے پردہ رکھتے ہیں تھوڑا سا...... باقی کچھ نہیں۔ انگریز ٹورسٹ منع ہیں بڑی مشکل سے اجازت ملتی ہے۔ مسز اوبرائے بتا رہی تھی کے صرف وہ اور ان کا میاں کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کتنی عجیب بات تھی وہ ذرا بھی کونشس نہیں تھے۔ سارا بازار ایسا ہی تھا۔ دنیا کا کاروبار چل رہا تھا مگر کوئی جلدی میں نہیں تھا جیسے سے بھی دھیرے دھیرے چل رہا ہو ان کے ساتھ۔ ارے باپ رے باپ میرا شوق بڑھتا گیا...... لو اب کیا ہوگا'' کانٹا گورا'' کیسے کہوں گی میں دیکھنا چاہتی ہوں...... ادھر اندھیرا ہوتے ہی اس کدونا میں سرسبز نائیجیریا میں کیا ہوجاتا ہے۔ کتنے پھول مرجھا جاتے کھلنے سے پہلے۔ ایک سال ہوگیا۔ کسی کو کوئی غم مناتے نہیں دیکھا۔ مسکراتے ضرور نظر آئے تھوڑی سی بے وقوفوں والی ہنسی بھی۔ مگر قہقہے بے ساختہ چہرہ گلاب ہوتے نہیں دیکھا۔ کوئی عورت آنسوؤں بھری نظر نہیں آئی۔ قریب کے ملنے جلنے والیاں تو غم کا مطلب ہی نہیں جانتی شکوہ نام کی کوئی چیز سے بھی ان کا واسطہ نہیں۔ یہاں تک کے ایک گھر کے چار حصوں میں رہنے والیاں۔ ایک آدمی کے روٹی کپڑے پہ گزر کرنے والیاں بھی وہی سکون لیے ملتی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہ ہمارا مجازی خدا ہے اس کی اولاد ہم سب کی اولاد ہے۔ آج رات تمہارے پاس کل رات میرے پاس پرسوں اس کے پاس۔ یہ ہمارا ہے ہم سب اس کے ہیں۔ چاروں بیویاں میں

نے اتنے سکون واطمینان سے رہتے دیکھی۔ مجھے تو کسی چہرے پر کرب نظر نہیں آیا...... پہلی دفعہ میں نے چار گھروں کے مالک کے گھر جانے سے انکار کیا تھا۔ آخر وہ افریقہ کے منسٹری انفارمیشن کا ڈائریکٹر تھا۔ اس کا افسر تھا عبدالحئی تھا...... اس کے گھر...... جب میں اُس قلعہ نما محل کے اندر چار گھروں کے گنبد کے قریب پہنچی تو میرے پیر کانپ رہے تھے۔ کیسے میں یہ سب برداشت کروں گی۔ چار بیویوں کا آقا ایک تھان قبا میں لپیٹے کھڑا تھا۔ سرمہ لگائے۔ عطر کی خشبو میں مسٹر عبدالحئی گردن کو اکڑائے کھڑے تھے۔ ''سنؤ''۔ ''لافیالو''۔ ''نا گجیا'' ''با گجیا''...... چار باریک آوازیں۔ جھکے سر پر سنہری روپہلی اسکارف باندھے ان کی چاروں بیویاں کھڑی تھی۔

یہ ہیں ہماری بیویاں۔ اسلامی طریقے کا یہ گھر ہے سب کا اپنا اپنا حصہ ہے ہم کسی کی حق تلفی نہیں کرتے۔ وہ انگریزی میں ہمیں بتارہے تھے۔ یعنی تم بھی مسلمان ہو۔ ہم بھی مسلمان ہیں دونوں ملک مسلمانوں کے ہیں۔ الحمدو اللہ یہ سب ہمارے بچے ہیں۔ مختلف عمروں کے سیٹ تھے گہرے سیاہ۔ براؤن ہلکے براؤن۔ سیاہ اودھے نیلے کالے سرمئی۔ اللہ میاں نے کتنے مختلف براؤن کے رنگ بنائے ہیں۔ حیرت ہوتی تھی جوں جوں میں بازاروں میں چلتے پھرتے سیاہ رنگوں کے دھبے دیکھتی۔ براؤن سیلٹی۔ سرمئی برگنڈی میں براؤن ضرور ہوتا...... سُرخ مٹی بجری سڑکوں پر بچھی ہری سبزہ زار ہریالی چاروں طرف پتوں سے ٹپکتی ہوئی نسیم کے قطرے چہروں پہ گرتے رہتے۔ ایک سال میں ایسا لگا جیسے ایک غنودگی کا ماحول ہے۔ بس آہستہ آہستہ سبزہ زاروں میں تیر رہے ہیں۔ میرا ہنسنا رونا بھی مجھے یاد نہیں رہا۔ سوچنا کیا چیز ہے۔ ایک طرح کی بے خودی۔ جس میں سانس لے رہی تھی۔ ''صبح سے شام تک زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے۔ نائیجیریا کا ماحول دیکھ کر اپنے گھر کا آدمی مظلوم لگنے لگا۔ سارا معاشرہ ہی وحشی ہے۔ پھر ہم لوگ کیوں اس قدر سخت ہیں اپنے شوہروں کے لیے۔ ایک سے زیادہ عورت ملنے پر یہ آفت کیوں ملے۔ یہ مسز چوہدری نے مجھے کئی دفعہ باتوں باتوں میں بتایا تھا۔ اے ہے بہن جب آپ کئی سال اپنے میاں کے پاس نہ آئیں تو ہم تو آپ کو بہت برا کہتے تھے۔ اب آپ کا شوہر کئی سال اکیلا رہا تو کیا تنہا وہ نمازیں پڑھتا رہتا۔ آخر مرد ہے اکیلے خراب ہونے کا امکان تو بہت زیادہ تھا۔ بچے کے لیے بڑا روتا تھا بیچارا۔ پھر بچہ بھی نہیں بھیجا۔ مسز چیما بھی ہنستے

ہوئے کہہ رہی تھی کہ کیسی عورت ہے مسز گل جو اپنے شوہر کو اکیلے شہر پردیس میں آنے کی اجازت دے دی۔ میں کیسے بتاتی۔ کاش میں مسز چیما کی طرح ہوتی اپنے میاں کو اجازت دینے کی طاقت ہوتی۔ یہ اعزاز مجھے نہیں نصیب۔ میری کیا مجال کہ میں اُن سے ایسے مخاطب ہوں۔ مجھے تو بینک کی بک باہر رکھی تھی اور میں نے اتنا کہا کہ یہ سب پیسے آپ بینک سے نکال لائے۔ تو مجھے جو ڈانٹ پڑی تھی۔ Dont touch my money, Never یہ میرے پیسے ہیں تمہارا کوئی حق نہیں ان پر۔ وہ دن اور آج کا دن کبھی روپے پیسے کی بات ہی نہیں کی۔ پہلے ہی وہ کونسے مجھے پورے پیسے دیتے تھے۔ ۴ سو روپے ہر مہینے کھانے اور رہنے کے دیتے تھے اور بس۔ کبھی نہ کپڑے بنائے نہ گھر کی کوئی چیز خریدی مجھے یہ مراعات نصب نہیں ہوئیں۔ جو مسز چیما اور مسز علوی کو نصیب ہیں۔ وہ بیویاں ہیں۔ ساری تنخواہیں میاں بیوی کے ہاتھ میں دیتے ہیں۔

حوّا

نہ تاریخ یاد دن بھی دھندلا سا ہے
ابھی ابھی جاگی تو یاد آ رہا ہے
سر میں سخت درد ہے کیا ہوا تھا کچھ یاد آ رہا ہے

کل مسز معید کے ساتھ جا کر چیلارام کے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر غضب کیا۔ اگر میں کرسی پر شیشے کے سامنے نہ بیٹھی تو ''حوّا'' نہ مجھے دیکھتی نہ اندر آتی۔ ویسے کمال ہے اس کا مجھے پہچان لینا۔ تصویر دیکھی ہوگی اور ذہن میں رکھا اور بس یاد رہی۔ میں نے اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔ میں کاہے کو اُس سے جلتی۔ مسز معید خفا ہو رہی تھی۔ اس کو گالیاں دے رہی تھی۔ مجھے تو رتی برابر بُری نہیں لگی۔ اس کا کیا قصور اس کا کام ہے ہوٹل میں رہے لوگوں کا دل بہلائے۔ لوگ اسے سینما لے جائیں کھانا کھلائیں وہ سب پیسے بینک میں رکھ دیتی ہے کچھ تھوڑی سی کمیشن کے بعد۔ نبیل کی تصویر دیکھی تھی آخر وہ بھی عورت تھی۔ مجھے نہیں معلوم ہو سکا ''حوّا'' کیا سوچتی ہوگی۔ اس نے صرف مجھے پوچھا تھا کیا تم مسز یوسف ہو...... میں حیران تھی یہ سنہری اسکارف

پہنے فلانی عورتوں کی طرح کی جوان عورت یہ مسلمان نہیں ہو سکتی۔ موٹر سائیکل پر سوار کیسے بغیر کسی جھجک کے اُتر کر آ گئی۔ گرمی سے اس کے ہونٹوں کی طرف خم جہاں پڑتے وہاں نقش ونگار کرنے والی نے ہونٹوں کے دونوں سروں پر چھوٹی چھوٹی پنکھیاں گود دی تھی۔ جب وہ مسکراتی تو بند پنکھیاں کھل جاتی۔ کالے چمکدار براؤن رنگ میں نیلے نیلے چھوٹے چھوٹے پنکھے کھل جاتے۔ تو سارا چہرہ ہنسنے لگتا۔ کانوں کے پاس نیلے زیور کی لکیریں گدی ہوئی تھی اسی میں نیلی گدی ہوئی مالائیں۔ کیا کیا حسن نکھارا تھا۔ نقش ونگار بنانے والے نے۔ پھر دھوپ میں تپتا ہوا تانبا جیسے اس کے سارے چہرے پر پھیل گیا تھا۔

پھر جیسے مجھے نبیل کے باپ کا ٹائپ کریا ہوا خط کیسے سر سے ذہن میں سے پھیل پڑا۔ وہ لمبا چوڑا خط جو وہ گھر پہ بیٹھ کر گھنٹوں مجھے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا کرتا تھا، مجھے عبدالحیٰ کی رپورٹ دینی ہے اور وہ گھنٹوں ٹائپ ایک انگلی سے کرتا رہتا تھا اور میری اندر کی عورت نے کہا کہ پڑھ لے کیا بگڑتا ہے تیرا کیا جاتا ہے۔ کونسی پارسائی کا بھرم باقی ہے اس کا اور اُس نے چپکے چپکے پڑھ لیا۔ Hello cat eye تم کو میں Miss کر رہا ہوں۔ میں تمہارے لیے اچھے اچھے کپڑے لاؤں گا۔ آج جب نہا رہا تھا تو تم بے تحاشہ یاد آئی بڑے تولیے سے کیسے صاف کرتی تھی تم جیسے میں شیشے کا بنا ہوا ہوں۔ پگلی بے بی اور میرے منہ سے نکل گیا۔ اوہ تم حوا ہو۔ وہ تم کو بڑے لمبے لمبے خط لکھتا تھا۔ لیس لیس۔ اور سنڈے اس کا اسٹینٹ تم کو پڑھ کے سناتا تھا۔ لیس لیس تم کو کیسے یہ سب معلوم۔ تم مجھ سے لڑیں بھی نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے بھلا...... وہ شرما کر ہکلانے لگی۔ مجھے معاف کر دو۔ میرا قصور نہیں وہ مجھے بہت تنگ کرتا تھا مجھے کئی دفعہ مارتا بھی تھا۔ تالا لگا کر مجھے فلیٹ میں بند کر کے آفس جاتا تھا۔ پوچھ لیں۔ سچ کہتی ہوں بڑی مشکل سے میں نے دن کاٹے۔ اوپر ''بٹورا'' جرمن اس کو رحم آیا اور برآمدے سے اس نے بیڈ شیٹ باندھ کر مجھے اُوپر چڑھایا اپنے برآمدے میں تب کہیں میں نکل سکی۔ میں نے اُس سے لکھوا دیا کے میں اپنے گاؤں جا رہی ہوں اور اس جرمن کے ساتھ ایک ہوٹل میں شفٹ ہوگئی۔ ایک دن اس نے سینما میں مجھے اس کے ساتھ دیکھ لیا اور کچھ نہیں کہا دیکھتا رہا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اُس نے جرمن ''بٹورے'' کے سامنے دو سلیپ لگائے۔ میرا کئی دن تک منہ سوجا رہا۔ جرمن ''بٹورا''

کہتا رہا اس کی رپورٹ کر دو۔ یہ ۲۰ پاؤنڈ میں گواہی دوں گا۔ مگر پولین نے منع کیا۔ ۲۰ پاؤنڈ میں نے بینک میں جمع کر دیے۔

میرا سر چکرا رہا تھا، کیسے یہ سب ہوگیا۔ تمہاری آنکھیں سُرخ ہو رہی ہیں۔ میں تمہارے سر میں تیل ڈال دوں۔ مسز معید تیل ڈالتی جاتی تھی اور میں اپاہج سی بنی سر میں تیل ڈلوا رہی تھی۔ وہ زور سے غصے میں میرا سر اپنے ہاتھوں سے مل رہی تھی اور نہ جانے کتنی گالیاں دیتی جارہی تھی۔ آخر آپ کو منہ لگانے کی کیا ضرورت تھی ''چھنال'' سے۔ نئی گالی نے مجھے چونکا دیا۔ کیا اچھا لفظ فٹ ہوا اور ایک ٹھنڈی سی لہر سارے جسم میں پھیل گئی۔ چھنال۔ مجھے واقعی کوئی ایسا لفظ چاہیے تھا جس میں بے چارگی بھی اور مطلب پوری طرح واضح ہو جائے۔ اس کا کام تو یہی تھا۔ جس پر وہ مجبور تھی۔ مگر مجھے اس کی طرف سے کوئی نفرت کوئی دُکھ نہیں تھا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ سب کچھ معلوم تھا پھر کیوں آئی۔ ایسی غیر تعلق زندگی گزار رہی ہو۔ جس کا کوئی مقصد نہیں۔ بار بار یہی کہنا کہ مجھے بھی پیار کرو مہربانی ہوگی۔ پھر تین سال کی دوری نے اور پردے ڈال دیے۔ اتنے لمبے چوڑے پلنگ پر وہ کیوں نڈھال ہوگئی۔ ساری تھکن ایران کی، اپنی ذمہ داری اٹھاتے تھک گئی تھی۔ سب کچھ بھول گئی۔ جیسے پہلے بچے میں جب تکلیف ہوتی ہے تو آسمان زمین ہل جاتے ہیں اور پھر عورت بھول جاتی ہے دوسرا بچہ پیدا کرنے کے لیے تیار ہوجاتی ہے۔ اب اُسے وہ پلنگ اژدھوں سے بھرا ہوا لگا۔ سامنے الماری میں قرآن رکھا مجھے بتا رہا تھا۔ یہ اس نے اُسی کے لیے خریدا تھا۔ تیرے لیے کیا چیز خریدی اس نے، کچھ بھی نہیں۔ وہ اس گھر سے اب کیسے بھاگے یہ تو ایران سے بھی بدتر ہوگیا اس کے سونے کے کمرے سے وہ گھبرا کر چھوٹے مہمان خانے میں آ گئی اُسی رات۔ ابھی اس کے آنے میں چار دن تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کے اُسے بتائے گی کہ تم کتنے ظالم ہو۔ اس کو اب سب کچھ پتہ ہوگیا ہے یہ چوتھی دفعہ پھر سے تم شرمندہ نکلے۔ مگر میرے بچے نے کیا قصور کیا۔ اس کا کیا قصور کے اُس سے اس کا باپ چھینا جائے۔ مگر وہ اس کے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔ پورے کدونا کو پتہ تھا صرف اُسے ہی یہ معلوم نہیں تھا۔ کاش کوئی ہمدرد مجھے بتا دیتی تو میں اس منحوس پلنگ پر اس رات پھر سے سپردگی میں نہ سوتی۔ اتنے سال چونکی رہی اُس رات کیسے نڈر ہو کے سوئی...... افسوس عورت کتنی بے

وقوف ہوتی ہے۔ پھر اس شہر کی تو ریت ہی نرالی ہے۔ چار چار گھر ایک ساتھ ہنستے کھیلتے ہیں اور میری طرح کوئی ایسا غم نہیں مناتا۔ خودداری کا۔ میرا جی چاہتا تھا مسز معید چلی جائیں میں نظریں نہیں ملاسکتی تھی۔ اب یہ سب عورتوں کو بتا دیں گی۔ گو بہت رازداری سے مجھے تسلی دے رہی تھی۔ ایران میں کیسے کیسے لفظ فارسی کی تہذیب لیے اُن لوگوں نے اشعار کی صورت میں مجھ پر نثار کئے تھے اور میں اپنے قدم سختی سے جمائے کھڑی رہی مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ نہ میں حسین ہوں نہ میں نازنین ہوں جو یہ سب خوبصورت لفظ کو سنبھال کر رکھوں۔ میرا بیٹا ہے مجھے کام کرنا ہے اور بس۔ اور آخر مجھے کیا ملا۔ اس عرصے میں مجھے خط لکھتا رہا خاموشی سے چھ مہینے تک یہ سلسلہ بھی رہا...... پروردگار مجھے اب اپنے آپ پر اعتماد ہو میں کسی کی باتوں کا یقین نہ کروں۔ آمین۔

پھر اُداس صبح ہے۔ اس وقت صبح کے ۹ بجے ہیں۔ نبیل بے چارے کو میں ابھی اسکول بس پر چھوڑ کر آئی ہوں۔ ہمداله ہوٹل کے فرنچ طرز کے سجے کمروں سے بھی دل بے زار ہوگیا۔ پورے دو مہینے اس دھاروں دار برساتی لگی بالکونی میں کھڑے کھڑے اور نرم گدوں کے پلنگ پر تنہا چپ چاپ لیٹے لیٹے یا باہر صبح دو پہر سوئمنگ پول پر ننگے جسم دیکھتے دیکھتے تنگ آ گئی۔ خدا خوش رکھے مسز علوی کو اور علوی صاحب کو جن کی بدولت اس کدونا میں گھر کا مزا مل جاتا ہے۔ کبھی دال چاول اور بینگن، کریلے، پالک کھانے کو مل جاتے ہیں۔ ورنہ تو بھلا دال پر ہی گزارہ ہے۔ مرغی گوشت، ران کا گوشت، ٹھنڈا گوشت تو نبیل میاں اور ان کے باپ شوق سے کھاتے ہیں۔ میں دونوں چیزیں ہی نہیں کھاتی۔ قیمہ قسم کی چیز نائیجیرین جانتے ہی نہیں۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال کی شکل تو ہم نے دیکھی ہی نہیں۔ کیونکہ بقول میرے شوہر کے وہاں کی روم سروس میں دو فائدے ہیں۔ ایک تو دو آدمیوں کا کھانا یعنی میاں بیوی کا کھانا، ہوٹل میں گورنمنٹ دیتی ہے۔ تین آدمی کمرے میں آرام سے کھالیتے ہیں۔ دونوں باپ بیٹے کولڈ میٹ اور ہوٹ میٹ آرام سے کھالیتے ہیں۔ میں صرف سلاد اور سوپ پر ہی گزارہ کرتی ہوں۔ مگر وزن کا ایک انچ بھی کم نہیں ہوکر دیا۔ اس دو مہینے میں۔

آخر کار اس حسین قید خانے سے آج ہم جا رہے ہیں۔ اپنے خود کے مہمان تھے ہم لوگ۔ میں اور نبیل آج جا رہے ہیں۔ آج ۱۸ تاریخ ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہفتے میں ایک دن مسز علوی کے گھر جاتے اور کھانا نصیب ہوتا اور چھ دن آرام سے گزر جاتے۔ یہ وہی کدونا تو ہے جس میں ایک سال سے زیادہ میں فلیٹ میں مسز گل کا بہروپ رچائے رہی تھی اپنے چھ سال کے بچے کی خاطر...... تین سال ایران میں ایسے تنہا اور عذاب میں گزارے...... ایران میں ہر چلتے پھرتے مرد کو یہ پاپا کہتا اور ہر گاڑی والے کی گاڑی میں بیٹھنے کی ضد کرتا...... پی پی اور پاپا سے تنگ آ کر میں نے ایران کی نوکری اتنی مشکل سے چھوڑی اور پھر مسز گل کا روپ دھار کر ایک سال اور غارت کیا۔ اب نائیجیریا کی گورنمنٹ کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے میاں بیوی کی ملاقات کے لیے آنا پڑتا ہے بچے کو باپ کی ضرورت ہے اور مجھے پاکستان جانے کی ضرورت اسی ٹکٹ سے پوری ہوگی...... اللہ۔ اللہ خیر صلا......:

اب کے مسز گل کا چغہ پھر سے پہن کر نبیل کی خاطر اس کے باپ کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوگئی تھی مگر پھر اتنے سالوں بعد بھی کیسے ہم دونوں میاں بیوی کا کھیل رچائے تو بیٹھے ہیں۔ صرف میں ہی نقصان میں ہوں۔ ساری عمر میں ہی اسٹیج پر رہی۔

نبیل اپنے لیے ڈھیر سارے چاکلیٹ خریدنے اور اسپین ہوائی جہاز کے لیے ٹریولر چیک بنوانے گیا ہے۔ جو وہ لندن جاتے ہی باپ کے بینک میں جمع کر دے گا۔ اسپین جا تو رہی ہوں۔ اسپین جا کر مسجد قرطبہ بندہ نہ دیکھے تو کیا خاک اسپین جائے گا۔ مگر چپکے سے میری نیک پروین نے کہا شکر کرو کہ اللہ تم کو اسپین کا موقع تو دیکھنے کو ملے گا۔ خدا کا شکر کہ نبیل مان گیا میرے ساتھ اسپین جائے گا۔ وہ تو لندن جانا چاہتا تھا...... باپ کی طرح آدم بے زار، گھر، ٹی وی، اسکول۔

مسز چیما، مسز نذیر، مسز بشیر یہ ساری مسز جو لاہور بھاٹی گیٹ اور سیالکوٹ کی رہنے والی ہیں۔ نائیجیریا کی سیر ہی کیا کم ہے ہوائی جہاز کا سفر پھر کراچی ہوٹل میں رہنا۔ یہ کیا کم بات ہے کہ دنیا کے اتنے شہر دیکھے مگر کیا وہ اٹلی، روم، بیروت، اسپین تمہاری طرح اکیلی گھوم سکتی ہیں۔ وہاں کے میوزیم اور خوب صورت چیزیں اکیلی دیکھ سکتی ہیں۔ کیا ہوا اگر ان کے بکس کے بکس گھر

کے کھانے کے پیسوں سے بچا کر کپڑے خرید کر بھر لیے۔ وہ تم سے زیادہ ہر چیز بازار سے خریدتی تھیں۔ درجنوں شلوار قمیض خرید کر تم کو سارے سال جلاتی رہتی ہیں۔ اپنے اپنے میاؤں کے ساتھ بن سنور کر نائیجیریا کی اداس شاموں میں کاروں میں سیر کرتی پھرتی ہیں۔ بچوں کی بنالین بھر کے اور چار پانچ گھر جا کر چائے پر تھوڑا تھوڑا پاپڑ کھا کر رات کے کھانے کے پیسے بچا کر ایک جوڑے کپڑے کے پیسے اگر نکال لیتی ہیں تو کیا ایسی آفت ٹوٹ پڑی۔ ہر رات وہی تو عذاب سے گزرتی ہیں۔ الفاظ سے عاری مردوئے جو ہر وقت اسی شان سے کاروں سے اترتے اور بیٹھتے ہیں آگے آگے چلتے ہیں پیچھے پیچھے بیوی یا بچے: رعایا کی طرح لیے ایک دوسرے کے گھر چند گھنٹوں کی بات چیت نظر کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے آفس کے بارے میں پیسے اور تنخواہوں کے بارے میں پوچھ گچھ کے بعد پھر گھر، سوشل لائف ان کے لیے یہی بہت ......

نائیجیریا، کدونا میں اکثر انجینئر، ڈاکٹر، کلرک، اکاؤنٹنٹ، منیجر جو بھی پاکستانی آئے تھے ان کی بیویاں کافی حد تک اُن میں سے تھیں۔ جنہوں نے فریج اور کار پہلی دفعہ ہی استعمال کی...... کچھ پڑھے لکھے خاندانوں میں مسز نبی، مسز مہناس رفیعہ، مسز جسٹس ایم بی احمد، مسز خورشید بیگ۔ یہ سب پڑھی لکھی کراچی اور لاہور یونیورسٹی کالجوں سے نکلی ہوئی خواتین تھیں۔ ان کے رہنے سہنے، ملنے جلنے سے اندازہ ہو جاتا تھا۔ نہ وہ بندے کا شجرہ نسب پوچھ کر خود ہلکان ہوتی تھیں نہ دوسرا...... پارٹیوں میں عورتیں کھسکتی کھسکتی لیڈیز روم بنا لیتیں۔ بچوں کی اور اپنے میاؤں کی چاہت کے بہانے ایک دوسرے سے مقابلے شروع ہو جاتے۔ کھانے پکانے کی ترکیبیں کئی کئی گھنٹے تک چلتیں اور میں ان ساری بیگمات کے ساتھ کیسے چلتی رہتی جہاں تک وہ چاہتیں خریداری کی لسٹیں لے کر۔ دعوتیں ختم ہو جاتیں۔ گھروں کی طرف گاڑیوں میں بیویاں ساری رپورٹ دیتیں اور دوسرے دن کون کس کے ساتھ ڈے گزارے گا۔ شوہروں سے آگاہی ہوئی۔

ہائے بے چاری مسز گل نوں وی بلالو او ہوٹل وچ کلّی اے اور میں اس ہمدردی اور ترس کھانے کی وجہ سے ہر گھر میں بلالی جاتی۔ صبح کی کافی۔ پارٹی پر۔ رات کے کھانوں پر...... اللہ کا شکر یہ چکر آج رات کو ختم ہو جائے گا اور مسز گل خیر سے اپنے بیٹے کے ساتھ واپس چلی جائیں گی۔ گورنمنٹ تو ہر سال میاں بیوی ملا دیتی ہے۔ اب یہ اپنی اپنی قسمت کہ میاں بیوی سے ملے

یا بچے سے...... باپ کو بچہ اور بچے کو باپ چاہیے تھا۔
نئے ہوٹل کی فٹ پاتھ پر اتنی دفعہ میں دکانوں پر جاچکی ہوں کہ اگر آج آخری بار پھر گئی تو مسز میتھوس کے لیے سانپ کی کھال کا ان کی فرمائش کا پرس بھی نہیں لیا تو کیا ہوگا۔ کتنی دفعہ اس نے مجھے پھول بھیجے ہیں محض سانپ کے کھال کے پرس کی وجہ سے۔ کتنی خوش نصیب ہو تم کہ افریقہ جا رہی ہو مجھے سانپ کی کھال کا پرس چاہیے یہ اس کی زندگی کی تمنا ہے۔
میں نے سوچا تھا ہمارے ساتھ سانپ ساری زندگی چلتے ہیں اور یہ مسز میتھوس مرنے کے بعد چاہتی ہیں سانپوں کو۔ اس نائیجیریا کی لمبی گھانسوں میں کتنے سنپولے چھپے بیٹھے ہوں گے شام کو سیر کو جاتے ہوئے تو میں ڈر جاتی تھی۔
ان پچاس پونڈ میں کیا کیا خریدوں۔ مسز میتھوس میری دیوار بیچ پڑوسن ہیں جن کے میاں ہمارے پیچھے لان کی زمین میں آلو، سلاد، گوبھی ہر فصل بوتے ہیں اور لق و دق پچھلے لان کی نوک پلک بھی سنوار دیتے ہیں۔ آدھی سبزی بقول ان کے وہ ہم کو بھی دیتے ہیں اور میں بھاری بھاری کھچا کھچ آلو کے تھیلے اٹھانے سے کچھ دن کے لیے بچ جاتی ہوں۔ اگر اس دفعہ ۱۵ یا ۲۰ پونڈ خرچ بھی کر دیئے تو کیا ہوگا۔ آج خرید ہی ڈالوں یہ سانپ کی کھال کا پرس...... مگر مدرید (Madrid) میں کیا کروں گی۔ یہ نائیجیریا مجھے اس لیے ہی تو اچھا نہیں لگتا۔ اس ملک نے اتنے سال کے عرصے میں ہمیشہ مجھے صرف گھر والی بنایا۔ کوئی نوکری نہیں کر سکتی۔ صرف گھر کا کھانا ایک سال مسلسل پکا کر دیکھ لیا۔ اپنے پیسے کمانے کی عادت پیسے نہ ہونے کی کئی جگہ تکلیف دیتی ہے۔ میں یہاں میاں کی صرف گھریلو بیوی ہوں۔
فقط فلاں کی بیوی۔ بس تمہاری یہی شخصیت ہے تم خود کچھ نہیں ہو۔ ہوٹل سے کل رات اترتے ہوئے سیڑھیوں پر چلیں۔ یہاں کی وہ عورتیں جو ہوٹل کی ملازم ہیں جن کا کام تنہا لوگوں کا صرف دل بہلانا ہے تاکہ تنہا ہوٹلوں سے وہ بھاگ نہ جائیں...... بیوی بچوں کو بلانے میں گورنمنٹ کرایہ دیتی ہے پھر کھانے والے کو اپنی تنخواہ سے آدھے سے زیادہ حصہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ پھر وہی بیوی وہی بچے...... ہر روز کی نئی نئی فرمائش وہ کھانا جو بیوی پکانا جانتی ہے کھانا پڑتا۔ یہ سب بے کار کا جھنجھٹ بے کار کا بکھیڑا ہے، کہاں یہ سکون کہ صبح آرام سے ہر روز نیا جسم

علیحدہ علیحدہ کھیل اور قصہ ختم۔ دفتر گئے۔ دن بھر کام کیا۔ گھومے پھرے نہ خوف آیا۔ نئے ملک میں لوگ کون کسی کی فکر کرتا ہے کہ اندھیرے کمروں میں پچھلے دروازوں سے کون آیا۔ کون گیا۔ پھر دوسری زبان ہونے کے کیا کیا فائدے کون کسی کی غیبت کرے کہ کسی کو کتنے لوگوں کی دعوت میں چلے گئے منہ کا مزہ بدلنے کو سب نے ہمدردی کی۔ اکیلے آدمی کو وطن سے دور تنہا مرد کو کھانے پر ضرور بلاؤ۔ بے چارے کو۔

جس کی بیوی بھی نہ پاس ہو۔ بے چارا اچھے کھانے کو ترس گیا ہوگا۔ سب طرح کے مزے میں رہتا ہے ایسا مرد۔ اور ان کی بیوی کو جو کبھی کبھار سال میں ایک دفعہ کسی اسکیم کے تحت بلا لی جائے تو اپنی ہی برادری کی عورتیں کیسے کیسے گھور کر کھا جاتی ہیں۔ طعنوں کی منتظر رہتی ہیں۔ عورت ہی خراب ہے بے چارہ میاں تو ایک سال سے بلا رہا ہے۔ غریب ہوٹل میں رہتا ہے گھر کے آرام سکھ کو ترس گیا۔ یہ سب میں برسوں سے سنتی چلی آئی۔ وہ میاں لوگ جو میری تعریف کرتے جو دفتر میں تھے مجھے بہت ہمدردی کرتے اور میں ان کی مجبوریوں سے محظوظ ہوتی رہتی۔ یہ لوگ مجھے ہمدردی جو جتا رہے تھے۔ وہ اپنے جیسے مرد سے جل رہے ہیں اور ان کی بیویاں پارسائی کے پردیسی لباس پر فریفتہ ہو جاتیں، تمکنت سے کھانے کی میز چن کر پھولی نہیں سماتی تھیں۔ جیسے مجھے کہہ رہی ہوں۔ اچھی شریف بیویوں کو یہاں ضرور رہنا چاہیے ہیں۔ جو بڑی گھریلو اور نیک ہوتی ہیں۔ ہمیں تو کبھی ہمارے میاؤں نے ایک رات بھی الگ نہیں کیا۔ اپنے لاہور سے واٹر انجینئر جو بڑے مذہبی مسلمان تھے، ٹی وی پر تقریریں بھی کرتے تھے ان کی بیوی مجھ سے بھی زیادہ صحت مند تھی جس کے چرچے کئی سال نائجیریا میں مشہور رہے۔ بڑے نیک صالح مسلمان ہیں اپنی بیوی کو بہت چاہتے ہیں۔ چھ بچوں کے بعد بھی۔ ایک رات کہیں دورے پر نہیں جاتے۔ بیوی کو ساتھ لے جاتے ہیں ساری دعوت کی عورتیں حسرت سے ان کو دیکھتی اور میں چاہتے ہوئے بھی نہیں کہہ پاتی کہ وہ محض کاہل شوہر ہیں جو موزے بھی خود نہیں پہن سکتے۔ دفتر جاتے ہوئے اپنا بریف کیس بھی کار میں نہیں اٹھا کر رکھ سکتے۔ ان کو بہترین نوکرانی کی ضرورت ہے جو تم ہو۔ ایسی خدمت گزار بیوی ان کو چاہیے عورت کی شکل میں اندھیرے میں کوئی عورت بھی ہو۔ ایک خاص پیمانے کی عادت جو ان کے ہاتھوں کو پڑی ہو اور بس۔ روشنی

میں نکاح نامہ کے ساتھ عورت ہو۔ جو بے حد ضروری ہے۔ بس بچوں کے ساتھ میز پر بیٹھنا بھی
ان ہی اصولوں میں شامل ہو۔ ایسی ہی بیویاں شادی میں کامیاب رہتی ہیں۔ جو ان کی ہاں میں
ہاں ملاتی رہیں۔ اپنی منطق نہ جھاڑیں۔ ان سے ساری دنیا کے مرد خوش رہتے ہیں۔

جاہل اتنی کہ بحث اور گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مردانے میں مردوں کا جھمگٹا
رہتا۔ کبھی کبھی لان پر اندھیرے میں آدھے صوفوں پر عورتیں اور آدھے پر مرد بیٹھتے مکس پارٹیوں
کا نام ہو جاتا۔ عورتیں بچوں کی نافرمانی اور بے ہودگیوں کے انکشافات ایک دوسرے سے کرتی
کپڑوں کی مارکیٹوں کے نئے پتے ایک دوسرے کو بتاتی رہتیں اور میں اتنے ڈھیر سے لوگوں
میں کتنے تنہا دور اپنے ملک کے چھیتوں میں سرگرداں اتنے جھمگٹوں میں مل جل کر بھی دور رہتی
تنہا، اُداس وہ کون سی خوشی ہے جو میرے پاس نہیں وہ کون سی سوچ ہے جو مجھے تنہا کر جاتی ہے۔
صرف ایک ننھے منھے خوب صورت سے چہرے پر جب میں جھکتی ہوں بھوری بھوری شفاف
آنکھوں میں جب جھانکتی ہوں تو جیسے بے قرار دل ٹھہر جاتا ہے۔ ورنہ پھر وہی سناٹے ویرانی لیے
کارواں کا خیال تنہائی کا سکون کھانے لگتا۔ مجھے کیا چاہیے اس اُداس روح کو کیا چاہیے کون سی
چاہت کا خزانہ خالی ہوگیا۔ یہ سب کس کو سناؤں۔ کس سے کہو۔ مسز احمد رفیعہ کے چہرے کی
اُداسی مجھے رفیعہ کے نزدیک لے آئی۔ نائیجیریا کی تھوڑی سی سیاہی بھی رفیعہ نے اپنے چہرے
میں ملوالی۔ وہ ہر دوسرے دن پارٹی میں جاتی اور ہیئر ڈریسر کی دکان بڑے ہوٹل میں تھی۔ جہاں
باہر سے آئے ہوئے میگزین مل جاتے اور بس ہفتے بھر کی بچت سے ایک آدھ میگزین میں بھی
خرید لیتی۔ مسز چیما کی ترکیب سے بجائے پیسوں سے نکالتی میں تو روز کی سبزی پھل میں سے
اتنے ہی پیسے نکال سکتی کہ ایک آدھ پونڈ کا ایک ویمن ہوم یا ہاؤس گارڈن خرید سکتی اور میرے کئی
ہفتے اس میں گزر جاتے۔

آج اٹھارہ تاریخ ہے۔ لہٰذا ہم لوگ چلے جائیں گے۔ جرمنی کی بنی سفید کریم رنگ کی
الماریوں سے کپڑے نکال لوں گی۔ میں نے یہ کپڑے ایسے لٹکائے تھے جیسے کسی کے مانگے
ہوئے ہوں۔ جیسے ان الماریوں میں اور بھی اچھے کپڑے لٹکے ہوئے اسٹائلش سے امریکن

خواتین کے قسم کے پہنے ہوئے میرے ملک کے پیارے لوگوں نے سوچا یہ عورتیں عجیب چیز ہیں۔ دوسرے ملک کے ڈیزائنوں پر جان دینے والی، ہر نئی چیز کو سراہنے والی یگانگت سے اُنہیں چڑ ہے۔ وہ ہر نئی چیز کو نیا رنگ دینا چاہتی ہیں۔ انوکھا۔ ایک خوبصورت سے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں سات منزلوں کے ہوٹل میں بظاہر میں ایک معزز بیگم صاحبہ ہوں۔ مگر میں ایسا لگتا ہے جیسے قید ہوں۔ بغیر کسی کو حساب دیئے خرچ کر سکتی ہوں اور نہ جا سکتی ہوں۔ لوگ ویسے ہی ظالم ہیں جیسے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ مسکراہٹ کے در پہ آزار، خوشی کے قاتل مگر میرا ابھی کوئی سوائے اس حسین غم کے جس کی آنچ میں آپ ہی جلتی رہتی ہوں۔ اس کو کیسے چھوڑوں۔ کیسے اِس محبت سے پیچھا چھڑاؤں۔ ایسی محبت جو میں نے پہلے کبھی نہیں کی۔ کوکھ کی آگ ہے جو دِل و دماغ کو ہلکے ہلکے کوئلہ کر رہی ہے۔

ایسی آگ مجھے کیا معلوم تھا...... ماں بننے کے بعد پتہ لگا۔ کاش اے ماں مجھے سمجھا دیتی کہ یہ کیسی ہوتی ہے۔ میں کبھی اسے ساگانے کی خواہش نہ کرتی۔ خوشی نہ جھیلتی۔ روح کے غم دماغ کو کندن بنا دیتے ہیں۔ مگر یہ غم تو یہ لگن تو مجسم جلا دی ہے۔ میں اپنی ماں کو اکثر اداس دیکھتی ہوں۔ جن کے تین بیٹے جو اُسی ملک میں اُن کے قریب ہیں۔ مگر وہ آج مجھے ضرور یاد کر رہی ہیں۔ یہ میرے دِل کے درد کی کسک بتا رہی ہے۔ جب میں عمرہ کرنے گئی تھی اور صفا و مروا کے طواف کے وقت اور میں نے نبیل کو بتایا تھا تمہاری طرح کا بچہ یہاں رو رہا تھا اور اُس کی ماں پانی تلاش کر رہی تھی۔ بے تحاشہ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہی تھی اور یہ جو در ہیں ایک در سے دوسرے در کی طرف جو ہمیں بھاگنا پڑ رہا ہے۔ تو وہ ماں بچے کی چیخ پر اِدھر سے اُدھر بھاگ رہی تھیں پانی کی تلاش میں۔ جو آج تک ساری دنیا کے مسلمان اس بے چینی کے لیے اُتنے ہی قدم وہاں اُسی طرح تڑپ کے ساتھ اُٹھاتے ہیں اور اب تک کتنے دِل و دماغ کے اِس جذبے کی قدر کرتے ہوں گے۔ تو مجھے بھی محسوس ہوا جب کہ میں اتنی دور آپ سے دور بیٹھی ہوں اور ماں کی محبت تو میں واپس ہی نہیں کر سکتی۔ میں نے بہت سی چیزیں اس مقدار میں حاصل کر کے واپس پھینک دیں۔ آپ کو میں کچھ نہیں دے سکتی۔ اور اُن پر نائیجیریا کی بجلی کی کڑک پردوں کے اندر تک کمرہ روشن ہو جاتا ہے۔ چند لمحوں کے لیے۔

پیرس میں چند روز

صبح ہی صبح جب میری آنکھ کھلی تو سامنے سنہری فریم میں سے بلجیئم کا قد آدم آئینہ، دیوار پر شفاف چہرہ لیے مسکرا رہا تھا۔ فرانسیسی شینڈ یلیئر کے چمکیلے کرسٹل چھت میں لٹکتے ہوئے لیمپ میں جھول رہے تھے۔ تو میں پیرس میں ہوں۔ مجھے ہوش آیا۔ ابھی میں کراچی کے خواب دیکھ رہی تھی جس کا ہلکا ہلکا تصور میرے سائیں سائیں کرتے ہوئے ذہن میں بڑے ہلکے پھلکے رنگوں میں پھیلا ہوا تھا۔ دل میں دکھ اور اتنی دوری کے تصور سے ہی کسک محسوس ہو رہی تھی۔ کتنے پیارے لوگوں سے دوری۔ اس اجنبی ملک میں (لندن میں، جہاں میں جنگ اخبار میں نوکری کر رہی تھی) اللہ میاں نے رحم کیا اور ایک مہینہ پیرس میں مفت گزارنے کا وقت مل گیا۔ یہ سب کیسے ہوا۔ معجزہ نہیں تو اور کیا۔ اللہ جب کسی کو کوئی نعمت یا کوئی صورت آرام کی میسر کرتا ہے تو عقل حیران ہو جاتی ہے۔ خدا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری اور میں اس تنہا کمرے میں ایک مہینے کی چھٹی پر پیرس میں اس خوب صورت نرم سے پلنگ پر لیٹی ہوں۔ جھبو بھائی کا فلیٹ ایک بوڑھی لینڈ لیڈی کا ہے۔ جس کا میاں ایک امریکن تھا۔ وہ اللہ کو پیارا ہوا اور یہ بڑی بی جھبو بھائی سے اس لیے خوش ہیں کہ ۲۹ تاریخ ہوتے ہی کرائے کا چیک چپکے سے صبح کی ڈاک میں مل جاتا ہے۔ اس نیکی اور ایمانداری کی وجہ سے نایاب نوادرات اس نے اس

فلیٹ میں رکھے ہیں اور آٹھ دس شینڈ یلیئر جو فلیٹ کے کمروں میں جا بجا لگا رکھے ہیں۔

سلور کٹلری اور سنہری فریموں کے آئینے چپے چپے پر لگے ہوئے ہیں۔ کل رات جب میں نہا رہی تھی تو احساس ہوا کہ دیوار میں آئینہ کے دونوں طرف جو لیمپ کے شیشے کے گلوب تھے وہ نپولین کی ٹوپی کی شکل کے تھے۔ میں حیران رہ گئی۔ بالکل نپولین کی ٹوپی شیشہ کی بنی ہوئی۔ جس میں مدھم روشنی نکل رہی تھی۔ یہ لوگ نپولین کو کسی نہ کسی طرح یاد کرتے رہتے ہیں۔

بڑی بی کا ٹیسٹ اچھا ہے میں نے پہلی نظر میں گھر دیکھ کر جھبو بھائی کو بتایا تھا۔ ارے بھائی ان کو بڑی بی نہ کہو۔ گیلری میں ایک خوبصورت عورت تولیہ اوڑھے کنگھیوں سے سر کی پشت کو دیکھ رہی تھی۔ تو یہ پینٹنگ ان کے امریکن میاں نے بنائی تھی۔ یہ سب باتیں تو ازراہِ تفریح ہوتی رہی تھیں شام کی چائے پر۔ مگر میں ابھی یہ سوچ رہی تھی کہ اس کمرے میں اس گھر میں، اس غسل خانے میں ہر جگہ امریکن کی روح بھٹک رہی ہوگی۔ کیسے کیسے خوش گوار لمحے ان شیشوں کی دیواروں میں جذب ہوئے ہیں۔ آخر یہ پیرس ہے جہاں رات ختم ہی نہیں ہوتی رات جگمگاتی رہتی ہے۔ ہنستی رہتی ہے اور صبح اوس پڑتے ہی سو جاتی ہے تو بی بی آپ پیرس میں ایک مہینہ مزے کریں گی۔

شموباجی اور جھبو بھائی اور تحسین کل جج پر گئے۔ تین کمروں کے فلیٹ میں میں اور فریدہ ہیں اور سعیدہ کی دونوں چھوٹی بچیاں، آمنہ اور سکینہ ہماری نگرانی میں ہیں۔ اورنج جوس کے دو کریٹ جھبو بھائی کل رکھ گئے۔ اتنے ڈھیر سے پیسے فریدہ کو بینک سے لے کر دیئے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ اب صرف سکینہ کو صبح اسکول چھوڑنا ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے، گیارہ بجے لانا ہے، پھر کھانا کھلا کر ایک بج کر ۲۰ منٹ پر واپس لے جانا ہے۔ پھر چار بجے فریدہ آمنہ کو ساتھ خود لے آیا کرے گی۔ میری ڈیوٹی صبح آٹھ بجے سے ایک بج کر ۲۰ منٹ تک ہے پھر میں خالی، فری، جو جی چاہے کروں۔ مگر میں تو راستے بھی نہیں جانتی۔ زبان بھی نہیں جانتی۔ یہ تو واقعی اجنبی ملک ہے۔ ۲۰ سال لندن میں گزارے، فرنچ تک نہیں سیکھی جو آج کام آجاتی۔ پاکستان میں ساری فارغ البال اور فیشن ایبل لڑکیاں، عورتیں فرنچ سیکھنے کا کورس کرتی ہیں پھر وہ خیر سگالی دورے پر اسکول کی طرف سے باہر فرانسیسی مشن کے تحت دورے کرتی ہیں۔ اپنے ملک میں رہنے سے

یہ تو فائدے ہیں۔ سب سے مزے میں گھر کی مالکہ رہتی ہے۔ ہمارے ملک کی ہاؤس وائف کا پروفیشن آج کل بہت نفع میں جا رہا ہے۔ مگر ایک شرط ہے کہ میاں چاہنے والا ہو تو چاروں انگلیاں گھی میں۔

شمو باجی بھی بڑی چہیتی بیوی ہیں۔ سیتاپور کی رہنے والی امی کے میکے کی شمو باجی جن کو سیتاپور میں میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ تو محرم میں کالا چنا ہوا دوپٹہ سیاہ غرارے کے پائنچے ہاتھوں میں اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ امّی کو آداب کیا اور ٹھیٹھ پوربی لہجے میں مجھ سے باتیں کرتی رہی جو اس زمانے میں مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آئیں۔ میں دلی سے پہلی بار اپنی ننہیال گئی تھی۔ کاتم'' کا سیتاپور پسند آوا!'' اور وہ اب اسی لہجے میں فرفر فرنچ بولتی ہیں۔ وہی دھیمہ دھیمہ بولنے کا انداز ٹیلی فون پر ایسی مہذب طریقے سے مجھے کہا کہ میں انکار ہی نہیں کر سکی۔

دیکھو اگر تم آ جاؤ، اللہ میاں کی قسم، تو ہم حج کر سکتے ہیں۔ ورنہ نہیں جا پاویں گے۔ اللہ تم کو اتنا ڈھیر سا ثواب ملے گا۔ بس تم چلی آؤ۔ یہ تم کو ٹکٹ بھیج دیں گے تم چھٹی لے لو اپنے دفتر سے، دیکھو انکار نہ کرو۔ فریدہ اور تم جلدی سے آ جاؤ۔ ورنہ حج نہیں کر پاویں گے۔''

اتنی محبت سے شمو باجی نے مجھے بلایا کہ تھوڑی دیر تو میں نے یہی سمجھا کہ اگر واقعی میں نہ گئی تو وہ حج ہی نہیں کر سکیں گی۔ اللہ میاں نے غلط فہمی میں بھی چار چاند لگا دیے ہیں۔

حقیقت کبھی کبھی بہت ہی زہر لگتی ہے نا؟

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ ودمن

۲۱ اکتوبر ۔ دو دن میں پیرس کی ٹھنڈی پھولوں میں بھیگی ہوا نے چہرے کو بھی گلزار بنا دیا۔ صبح ہی صبح سکینہ کو اسکول چھوڑ کر واپس آئی تو لفٹ سے لے کر دوسری منزل کے فلیٹ تک آئینے ہی آئینے لگے ہوئے ہیں۔ شیشوں کا شہر جو ہوا اور اس سے ویسے ہی پوچھنا پڑتا ہے کہ mirror, mirror دنیا میں کون سب سے خوبصورت ہے۔ اگر شیشہ کا اعتماد ہوتا تو پھر شاعر نہ کہتا کہ ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

شاید خوشی ہے کہ کام نہیں کرنا پڑے گا پابندی سے چھٹی ملی ہے تو چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حسن آپ کے اندر ہوتا ہے۔ ایران میں جب آپ کسی کی تعریف کریں تو وہ بڑی شائستگی سے جواب دیتے تھے چشائے شما قشنگہ است۔ تمہاری آنکھیں خوبصورت ہیں جو حسن ڈھونڈ لیتی ہیں۔ پابندی سے نجات ملی۔ فکر معاش نہیں، کوئی گھر کی پابندی نہیں کہ کھانا پکانا ہے گھر صاف کرنا ہے خریداری کرنی ہے، یہ سب کچھ نہیں۔ نیا شہر نیا گھر نئے لوگ شہر و مکان نیا اور میں اجنبی ہوں۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ یہ کیا کم خوشی کی بات ہے۔ ہر بات نئی۔ اس خوشی سے میں خود سرشار ہوں۔ یہ دونوں بچیاں انگریزی کھانے کی عادی ہیں بغیر مرچ کے

کھانے۔ بیف اسٹک تل دیئے گوشت کے ٹکڑے ٹماٹر تل لیے اور کھانا لنچ ڈنر تیار۔ ویسے بچوں کو میرے ہاتھ کا کھانا بھی پسند نہیں ہے (خدا نے مجھے بچالیا)۔

پچھلے ہفتے کے بعد سکینہ نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ اللہ میاں نے مجھے اسکول جانے سے بھی بچالیا ایک ہفتے کی چھٹیاں اور آرہی ہیں۔ اس کا مطلب پورے ایک مہینے میں مجھے صرف ایک ہفتے جانا پڑا اسکول۔ باقی اللہ میاں کی مہربانیاں رہیں۔ آج پروگرام بنایا ہے کہ سب سے پہلے میوزیم دیکھو۔ پھرانو یلد نپولین کا مقبرہ۔ جمو بھائی نے جاتے ہی کار میں مولاروژ پکالے شانزے لیزے دکھا گئے تھے۔ سارے دکانداروں سے ملا گئے تھے۔ عرب بھائی کی دکان جہاں مصالحے حلال گوشت وغیرہ ملتا ہے۔ یہاں پاکستانی چوک بھی کہلاتا ہے ایک بازار، جہاں پولیس کو امیگریشن کے سلسلے میں مدد مل جاتی ہے۔ اپنے ہی ملک کے لوگ خفیہ اطلاعات دے دیتے ہیں یہاں کی پولیس کو کہ جرمنی سے کتنے نئے آدمی آئے اور آرہے ہیں مگر اس خوبصورت فلیٹ میں نہ ریڈیو نہ ٹیلی ویژن نہ اخبار اور ان تینوں چیزوں کے بغیر زندگی حرام۔ بتاؤ بی بی ایک مہینہ ریڈیو ٹی وی اور اخبار کے بغیر کیسے گزاروں گی۔ اتنی دکانوں پر ڈھونڈ ڈھونڈ کر ٹیلی گراف کا مڑا ہوا اخبار جو کسی کے لیے ریزرو کیا ہوا تھا دیکھا تو اتنا پیارا لگا۔ ہر طرف فرنچ اخبار رسالے۔ آج پاکستان ایمبیسی ضرور جاؤں گی۔ تاکہ اپنے اخبار تو ملیں پڑھنے کو ایک ہفتے میں نہ جانے کیا سے کیا ہوگیا ہوگا۔ اپنے ملک میں دوسرے ملکوں میں، کیسی گھبراہٹ ہورہی ہے یہ سوچ کے۔ فریدہ سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایئر لیٹر اور پوسٹ کارڈ صرف ان دوکانوں سے ملتے ہیں جہاں TBOCO لکھا ہوا ہوتا ہے۔ کل بہت سے کارڈ خریدے پوسٹ کارڈ توبہ ہے کتنے مہنگے۔ ریستوران میں کل میں ہی کیا سارے ٹورسٹ کافی پی رہے تھے اور پوسٹ کارڈ میزوں پر بچھائے چپکے چپکے شیشوں کے باہر گزرتے ہوئے لوگوں کے بارے میں پیرس کی مونالیزا کے بارے میں ایفل ٹاور کے بارے میں لکھ رہے تھے۔ اپنے اپنے ملکوں سے دور کچھ اداس چہرے کچھ دور بیٹھے ہوئے لوگوں سے اتنے پاس بیٹھ کر بات کررہے تھے قلم جلدی جلدی لکھ رہے تھے۔ چہروں پر مسکراہٹیں تھیں۔ یہ دوری کبھی کبھی سخت سے سخت انسانوں کے بھرم کھول دیتی ہے اور میں سب کو چپکے چپکے دیکھ رہی ہوں اور فرنچ کافی کا ایک کڑوا گھونٹ پی کر اس غم تنہائی کو

دھکیل رہی ہوں۔ دوسروں کے غم جب ان کے چہروں پہ چمکنے لگیں تو اپنے قدموں میں کتنی زیادہ
طاقت آ جاتی ہے راہیں چھوٹی ہو جاتی ہیں ایک خوشی ہوئی یہ لوگ بھی چاہتے ہیں ایک دوسرے کو
مگر چہروں کو زندگی کے غم گسار ڈھونڈنے میں فنا نہیں کر دیتے۔ پیرس جو پھولوں اور سبزہ زاروں
سے گھرا ہوا ہے جہاں آرٹ نے جنم لیا۔ شائستگی و مہذب پیراہن کے فرغل پہنے حسینائیں شب
بیداری میں گزارنے والی حسینائیں جو پگال لیڈو اور مولا روژ کلب کے روح رواں حسینائیں
جن سے پیرس کی شہرت ہے۔ ایفل ٹاور بنانے والے آرکیٹیکٹ کا یہ اعزاز جس سے پیرس کا
حسن زندہ ہے آرچ آف ٹرائم کا شاہانہ رُخ جس نے بارہ شاہراہوں کو جنم دیا۔

شانزے لیزے کی جگمگاتی سڑکوں کو رونق کا اعزاز سیاحوں نے پہلے ہی دیا۔ دنیا جہاں
کے سیاح اس دلنواز پیرس میں بکھرے ہوئے ہیں ایسے چہرے جو زندگی کے رنج وفکر سے مبرا
صحت مند خوبصورت آزاد چہرے جن کو دیکھنے سے احساس ہوتا ہے کہ زندگی ان کو بہتر عزیز
ہے۔ اس کا ایک ایک منٹ ان کو بہت عزیز ہے۔ دنیا کا حسن دیکھنے کے لیے اگر انہیں پیدل
بھی چلنا پڑے تو قہقہے لگاتے مسافت طے کر لیتے ہیں۔ کھانا پینا آسائش کی پروا نہیں۔ کئی
امریکنوں سے جو کمر پر اپنے اپنے بستر کا بوجھ اٹھائے جا رہے تھے میں نے پوچھا کہ تمہارے
کپڑوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سفر کے اختتام پر ہی تم آرام کرو گے چہرے پہ تو تھکن نہیں
مگر کپڑوں تک سے لے کر بالوں کی جٹاؤں تک کئی مہینے کی مسافت کا پتہ دیتے ہیں۔

ہاں زندگی بہت تھوڑی ہے صبح شام دن رات۔ یہ ملک دنیا کے خوبصورت تحفے ہیں اتنی
تھوڑی زندگی میں کیوں نہ ان کو قریب سے دیکھیں اس کے لیے میلوں کے سفر بھی کم ہیں۔
سیاحت ہمیں پسند ہے۔ خدا بھی حسن کو پسند کرتا ہے ورنہ ایسے خود رو لالہ زار نہ بناتا۔

پلاس ڈی لاکونکورڈ

کیوں اسے خونِ رگِ دل نہ کہوں!

پیرس دنیا کے پانچ میں سے ایک مہنگا ملک ہے۔ دو دن میں ہمارے ہفتے کی تنخواہ ختم ہوجاتی ہے۔ ہمیں تو ہمارا لندن ہی پیارا۔ ایسی گم ہوگئی اتنی مہنگائی میں پہلے زمانے میں کسی کے گھر جب مہمان جاتے تھے، تو تحفہ وغیرہ گھر والوں کے لیے لے جاتے تھے۔ جوڑے سی کر لے جاتے۔ شب برات گزرے چاہے سال ہی ہوگیا ہو مگر لوازتوں کا حلوہ ضرور لایا جاتا۔ لیکن اس ایٹمی زمانے میں دستور ہی بدل گیا۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ پیرس کھانے پینے کے لیے بہت ہی مہنگا ہے، تو میرے بکس میں سے گھر والوں کے لیے جو تحفے نکلے وہ چاول کے دالوں، مصالحوں کے پیکٹ، چائے کے پیکٹ۔ پہلے تو سب چپ رہے مگر چہروں پر خوشی تھی۔ کئی جاننے والوں نے شکایت کی کہ ہرا دھنیا، ادرک تو لندن سے لے آتیں۔ سب سے زیادہ خوشی جو شمو باجی کو ہوئی وہ صبح میں اوڑھنے کی چادروں کی تھی۔ پاپلین کی چادریں جس کا ڈھیروں شکریے کا بوجھ اب بھی اُٹھائے ہوئے ہوں۔

قریب کا سارا پیرس تو دیکھ لیا۔ ایفل ٹاور کا باغ گھر سے دو قدم پر تھا جو شام کو بچوں

کے ساتھ کئی دفعہ دیکھ لیا۔ ایفل ٹاور تو گھر کی بات ہے۔ اسکول سے آتے جاتے محلے کے جتنے بھی بازار دکانیں تھیں سب ہی دیکھ ڈالیں۔ ایک بہت بڑا اسٹور جو وول ورتھ (Woolworth) کی طرح کا ہے اس میں کتنے ہی چکر لگا ڈالے۔ پیرس میں رہتے رہتے شینیل کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ آج کل کا معروف ترین پر فیوم اوپیم (Opium) ہے جس کی خوشبو میں دور دور تک نشہ ہے۔ ساڑھی ہاؤس جو یہاں کے میڈلن اوپرا ہاؤس کے پاس اوپر منزل میں دوکان ہے اتنی ڈھیر سی فرنچ شیفون دیکھ کر دل بھر گیا۔ جو دنیا کے حسین ترین رنگوں میں بھگوئے ہوئے تھانوں سے اسٹور میں بھری پڑی ہے۔ نقش نگار، پھول بوٹے آرٹ کے نمونے اتنے زیادہ تھے اور جیب میں صرف تصورات کا بسیرا تھا اور پہلی دفعہ اپنے عورت ہونے کا یقین ہوا۔

اپنے ملک سے آئے ہوئے افسروں کی بیویاں کیسے ایک درجن شیفون کی ساڑھیاں خرید سکتی ہیں۔ ان میں کوئی تو خوبی ہوگی جو ان کے افسر میاں لوگ تیس چالیس پچاس پونڈ کی ساڑھیاں خرید دیتے ہیں۔ تم سے ضرور اچھی ہوتی ہیں وہ خواتین۔ تم جل رہی ہو۔ وہ چپکے سے اندر بیٹھی ہوئی خاتون مجھے ہمیشہ ہی جگاتی رہتی ہے۔ بی تم تو سیر کرنے آئی ہو سو کرو۔ آج مجھے اکیلے ٹیوب میں جانا ہے۔ فریدہ نے مجھے ٹیوب اسٹیشن دکھا دیا تھا۔ ٹکٹ دلوا دیے تھے۔ پندرہ فرانک کے ۱۰ ٹکٹ۔ ایک ٹکٹ آپ اندر جاتے ہوئے ڈالیے باہر نکل آئے گا۔ اس پر لائن پڑ جائیں گی کالی کالی۔ تب دروازے سے آپ نکل سکیں گے۔ پھر کتنی ہی دور چلے جائیں کوئی نہیں پوچھتا۔ نکلتے وقت کہیں بھی چیکنگ نہیں ہوتی۔ صرف جاتے وقت آپ ٹکٹ ڈالیں۔ مگر یاد رہے کہ کالے ربڑ پر جو نیچے بچھا ہوتا ہے ٹکٹ نہیں ڈالنا چاہیے اس پر نہ کھڑے ہوں۔ ورنہ لائن پڑ جائے گی اور دروازہ نہیں کھلے گا اور ٹکٹ ضائع ہو جائے گا۔

ہمارے اسٹیشن کا نام کیمرون (Camron) تھا جسے فرنچ کیم غون کہتے ہیں۔ ٹیوب کو مترو کہتے ہیں۔ بس کو آتو بس کبھی بھی ٹیوب اسٹیشن پر کوئی چیک نہیں کرتا۔ بس میں جائیں تو صرف ڈرائیور ہوتا ہے۔ صرف بکس میں ٹکٹ ڈال دیں وہ لائین ڈال کر نکل آئے گا۔ کسی طرح کی کوئی ترکیب بے ایمانی کی نہیں ہو سکتی۔ بڑے بڑے ٹیوب اسٹیشن پر نقشے لگے ہیں۔ ٹیوب

لائنوں کے نام لکھے ہیں جس مقام پر آپ کو جانا ہو اس لائن کا بٹن دبا دیں ننھی بتیاں جل جائیں گی۔ سارے اسٹیشن روشنی سے اجاگر ہوجائیں گے۔ آپ کو کہاں بدلنا ہے بغیر کسی سے پوچھے آپ خود اپنی مدد کرسکتے ہیں۔ یہ سب نعمتیں اور اطلاعات میں نے پلو میں باندھیں اور ایمبیسی کا رخ کیا......

صبح کے ناشتے پر ایک دم فریدہ نے بتایا کہ ہم بچے ابا کے ایک فرنچ دوست کے گھر جا رہے ہیں۔ ان کی بیوی ابھی آتی ہوں گی لینے کے لیے ہم لوگ تو ان کے ساتھ جا رہے ہیں اور آپ یہاں کا میوزیم دیکھ آئیں۔ میوزیم اتنا بڑا ہے کہ شام کے ٦ بجے تک آپ رہ سکتی ہیں۔ اتوار کو وہ مفت ہوتا ہے آپ کے پیسے بھی خرچ نہیں ہوں گے۔ ہاں ضرور، ٹھیک ہے، میں راضی ہوگئی اور کپڑے بدلتے ہوئے میں نے سوچا کہ مجھے تو راستے بھی نہیں آتے زبان بھی نہیں آتی۔ یہ اپنے ابا کے دوست کے گھر مجھے لے جانا نہیں چاہتی۔ یہ تو سمجھ میں بات آگئی۔ میں کیا کروں گی وہاں جاکر۔ مگر فرانسیسی خاندان کا گھر دیکھنا بھی میں چاہتی تھی یہ لوگ کیسے رہتے ہیں۔ انگریزوں کے بارے میں تو اتنا معلوم ہوگیا ہے مگر فرانسیسی گھر ضرور دیکھنا چاہیے اور میں نے غسل خانے سے اپنے مطلب کو دوسرے رُخ سے پیش کیا۔ فریدہ مجھے راستہ نہیں معلوم نہ بس کا نہ ٹیوب کا۔ کیا میں تمہارے ساتھ جاسکتی ہوں۔ کچھ دیر خاموش رہی پھر فریدہ نے یقین کے ساتھ بہانہ بنا ڈالا۔ فرانسیسی لوگ مہمانوں کو نہیں بلاتے۔ ان کے بچے ان بچوں کے ساتھ کھیلنا چاہتے ہیں۔ وہ جنگل لے جا رہے ہیں۔ اب سوچیے میرا کیا حال ہوا ہوگا۔ پیرس کے جنگل میں بھی دیکھنا چاہتی تھی۔ دوسرے سارے راستے فریدہ نے یہ کہہ کر بند کردیے کہ فرانسیسی مہمانوں یا پورے اہل خانہ کو نہیں بلاتے جس سے دوستی ہو وہی جاسکتا ہے اور مجھے فرانسیسی پہلی دفعہ زہر لگے۔ بدتمیز کہیں کے۔ ہمارے ملک میں مہمان تو مہمان۔ ان کے نوکر نوکرانیاں ڈرائیور تک کھانے پر مدعو ہوتے ہیں۔ میں جلے بھنے انداز سے فریدہ کے ابا کے دوست کی بیوی سے ملی بوژوں مدام۔ بوژوں (Bon Jour) پھر وہ دیر تک کھڑی فریدہ سے فرنچ میں بات کرتی رہی۔ مجھے لگا کہ میرا قضیہ تھا۔ بحث کے درمیان سیدھی سادھی بیوی اور ماں لگتی تھی وہ عورت، میاں کار میں نیچے انتظار کر رہے تھے۔ میں تو تیار تھی بچے اور فریدہ توس مکھن کی انگلیاں صاف کر رہے

تھے ٹیپکنوں سے۔ میں نے بھی جل کر فریدہ سے آخری بار کہا مجھے اس کاپی پر اس گھر کا پتہ ٹیوب اور بس، ٹیلی فون انگریزی میں لکھ دو ان کے پاس گاڑی ہے مجھے نزدیک کہیں میوزیم کے چھوڑ دیں گے اس کے میاں اور فریدہ کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

اتنی ساری ڈمانڈ پھر تو شاید مجھے لے ہی جاتی اپنے ساتھ اگر اسے پہلے معلوم ہوتا تو اس نے چندمنٹ کھڑے ہوکر سوچا۔ آخر کار پیچھے کار میں بچوں کے باپ نے مجھے انگریزی میں بتایا کہ اگر تم نے راستے خودنہیں ڈھونڈے تو تم پیرس گھوم نہیں سکتی پہلے ہی دن کھو جاؤ گی۔ خود ڈھونڈو میں تمہیں میوزیم کے پاس چھوڑ دیتا ہوں۔ پیلس دا کنکورڈ کے پاس چھوڑ دوں گا۔ پھر تم ایک لمبے چوڑے باغ کو طے کر کے سیدھی چلی جاؤ۔ تین فوارے باغوں کے ساتھ ساتھ آئیں گے۔ اس کے بعد سڑک کراس کرو گی تو تم خود لوغ میں کھڑی ہوگی۔ اس کا تاریخی آرچ ہے اس کے بعد میوزیم لوغ شروع ہوجائے گا۔ شام کے سات بجے تک کھلا رہے گا اور کار خوبصورت بازاروں درختوں کی کرن لگی سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک پتھریلے میدان میں کھڑی ہوگئی۔ نیلے، سرمئی ،کاسنی، اودے، سلیٹی مختلف شکلوں کے چوکور گول لمبے چھوٹے بڑے پتھروں کا میدان دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جگہ جگہ مجسمے لگے ہوئے تھے۔ فواروں کی پھوار میں جل پریاں۔ ننھے فرشتوں کے جسم پتھروں میں بدل گئے تھے اور وہ پانی میں نہاتے جا رہے تھے۔ تالابوں کے چاروں طرف فرانس کے مختلف شہروں کا روایتی لباس پہنے وہاں کی رہنما سیاسی خواتین کے مجسمے پتھر کی زبان لیے خاموش کھڑے تھے۔ میدان کی آخری دیوار اونچی ہوتی گئی اور پل بن کر لوہے کے پھولوں سے بنی آہنی دیوار نے پڑاؤ ڈال دیا ہے۔ خوبصورت نارنجی پتوں سے ڈھکے درخت آسمانوں کو شفق بانٹ رہے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں جلسے جلوس نکلتے ہیں۔

اس میدان میں فرانس کے عوام اپنی اپنی ڈفلی اور اپنے اپنے راگ الاپتے ہیں۔ اونچی پہاڑی پر باغ پھیلتا جاتا ہے۔ ایک طرف اس کے بڑے بڑے بورڈ لگے ہوئے تھے اور امپریشنسٹ آرٹسٹوں کی گیلری تھی۔ اس میدان میں جس کو پلاس ڈی لاکونکورڈ کہتے ہیں میں بہت بڑی ہستیوں کے سر قلم کر دیے گئے۔ Revolution کے زمانے میں لوئی شیز دہم اور ان کی بیوی ماری انتونٹ کا بھی سر یہیں قلم کر دیا گیا تھا۔

لوئی شیز دہم کے زمانے میں فرانس میں بادشاہت تھی۔ غربا، کی کوئی پروانہیں تھی۔ غربت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگ بھوکے مر رہے تھے اور کچھ لوگ عیاشی میں گزر کر رہے تھے۔ انقلاب کی شکل میں بغاوت بڑھتی گئی اور اسی میدان کی مٹی میں ان نیلے پتھروں کے نیچے کتنا ہی خون بہا۔

پیرس کا میوزیم لوغ

۱۸۲۰ء میں وینس کا انکشاف ہوا۔ یہ مجسمہ جو Milo کے جزیرے میں گریک عورت کے حسن کا معیار سمجھا گیا۔ یہ مجسمہ تقریباً ۶ فٹ اونچا ہے۔ جو ایک سفید پتھر کے چھوٹے سے چبوترے پر رکھا ہوا ہے۔ ٹوٹے ہوئے ہاتھ کے بارے میں ابھی تک کوئی تحقیقات نہیں ہو سکی۔ Hellenistic Age میں بازو تھا یا صرف ایسے ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ شاید آرٹسٹ کے ہاتھوں میں اتنی قدرت تھی کہ وہ دوسرے ہاتھ کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتا تھا یا عورت کے حسن کا مظہر صرف چہرہ اور جسم کے کچھ حصے ہی قابل پرستش ہوتے ہیں۔ یہ بھی آرٹسٹ کے خیال کا پرتو ہے۔ اس مجسمہ کا انکشاف حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے دوسری صدی کی بات ہے۔

مورخین کے خیال سے مجسمہ ہیلینس نہیں ہے معمار کے مطابق جسم کی لچک کو جسم کے خوبصورت حصے کو اجاگر کرنے کا مقصد تصور میں کسی چیز کا سہارا لیا ہوگا۔ مصوری کے شیدائیوں اور نقادوں کا خیال ہے کہ مجسمہ حسن کے چاروں طرف جو چادر لپٹی ہے اس کے نیچے گرے ہوئے رُخ کو دیکھ کر کسی سہارے کے بغیر چادر جسم پر لپٹنے کے طریقے سے ماربل کی ابھری لائنوں کے انداز سے GODDESS تصور کی جاتی ہے۔ وینس کے مجسمے کے چاروں طرف مدھم روشنی ہے۔ دور سے سفید سنگ مرمر کا حسن پتھر کا پتھر پن دیکھتے ہی دیکھتے نرم خوبصورت

اطالوی آرٹسٹ مائیکل انجلو کا شاہکار جو ہنری دوئم فرانس کے زمانے میں میوزیم میں لایا گیا
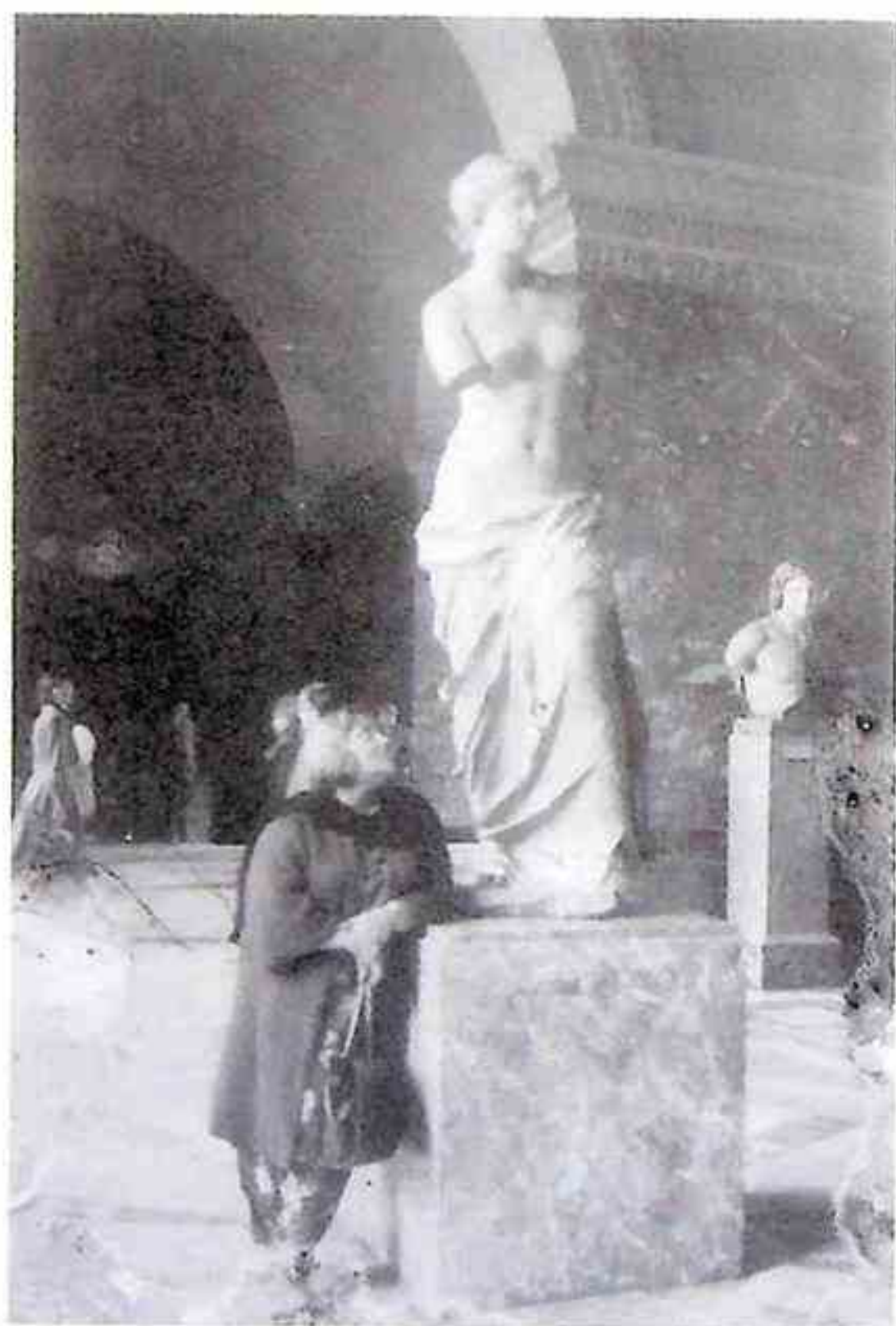
اور شفاف جسم میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ اور جسم میں زندگی کی حرارت محسوس ہونے لگتی ہے اور میں سوچ رہی تھی آرٹسٹ نے ہاتھ خود نہیں بنائے حسن کی دیوی کے ہاتھ میں یہ طاقت کہاں جو آرٹسٹ کے ہاتھ میں تھی۔ آج میری آنکھوں کی روشنی نے مجھے کیسا امیر کر دیا۔ امیر ترین عورت ہوں میں۔ اس میوزیم میں ساری زندگی گزار سکتی ہوں۔ نہ جانے میوزیم میں جگہ جگہ کھڑے یہ چوکیدار کیوں چہرے پر بیزاری چڑھائے زندگی سے بیزار ہیں شاید زندہ مردوں کے چہروں سے انہیں نفرت ہوگئی ہے اس لیے اپنے چہروں پر یہ ایک سیکنڈ بھی گھر سے آتے ہوئے بھی شاید نظر نہیں ڈالتے۔ کیا حسن سے بھی کسی کو چڑ ہو جاتی ہے یا شاید اپنے پیشے سے......

Louvre جسے فرنچ میں لوغ کہتے ہیں اس کی ابتدا تیرھویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ لوغ کی نئی عمارت جواب میوزیم کہلاتی ہے تین منزلوں میں بٹی ہوئی ہے۔

پیرس کا مشہور ترین میوزیم ہر روز کھلا ہوتا ہے۔ مصروف ترین عمارت ہے جہاں سیاحوں کا جم غفیر ہر وقت نظر آتا ہے۔ اتوار کو چوں کہ مفت ہے اس لیے روزانہ سے زیادہ لوگوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ سُرخ زرد پتھر کی عمارت سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر ستون ہیں اور ستونوں پر رکھی ہوئی یہ عظیم الشان عمارت جس کے چاروں طرف مجسمے پھیلے ہوئے ہیں۔ صدر دروازے پر فرانسیسی اطالوی مجسموں کے شاہکار نصب ہوئے ہیں۔ یہ سب مجسمے برآمدوں کی ۵۰۰۰ میٹر لمبائی پر پھیلے ہوئے ہیں۔ پتھروں کی سلوں سے بنا ہوا یہ محل خاموش بے جان چہروں سے پر ہے۔ خاموش مگر چہروں کے نقش و نگار لباس کی تراش سے اپنے اپنے ملکوں کی زبان بنے ہوئے ہیں۔ مصری یونانی، رومانی، فنکاروں کے شاہکار مشرقی فن کے نوادرات دوسری تیسری منزل پر نقاشی اور مصوری پینٹنگ کے حسین ترین فن پارے مدھم روشنیوں میں نارتھ ونگ سے ویسٹ ونگ تک بکھرے ہوئے ہیں۔ پہلے حصے میں گراؤنڈ فلور پر ایسا لگتا ہے جیسے لٹیروں کو ملک جیتنے کے بعد جو بھی حصہ ملک کا ملا وہ اٹھا لائے تاکہ ثبوت رہے فاتح ہونے کا...... اسی حصے میں وینس، اپالو، اٹلی، مصر کے پتھر کے مجسمے، عمارتوں کے ٹکڑے ہیں۔

لوغ میوزیم کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ عمارت کئی دفعہ بنائی گئی توڑی گئی۔ مختلف عہدوں میں مختلف ملکوں سے آئے ہوئے مشہور آرکیٹیکٹ آئے جس میں فرانس کے بعد اٹلی

کے نام کو فوقیت دی گئی۔ خواتین کا انقلاب اکتوبر ۱۷۸۹ء میں فرانس کی ہسٹری میں ایک انوکھی نوعیت لیے ہوئے ہے۔ زبردست مظاہرے ہوئے ان کی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے کہ نپولین کا خاندان فرانس میں بسنے کا اہل ہوا۔ اس میوزیم کو شاہی محل بنانے کا خیال تھا۔ مگر کوئی شاہی خاندان اس میں نہ رہ پایا۔

نپولین نے اس عمارت کے کچھ حصے گروا کر ازسرنو تعمیر کروانے شروع کیے۔ فلپس آگسٹس نے محل بنوایا جو تعمیر کا ایک حسین نمونہ تھا۔ بیری آرکیٹیکٹ نے قلعہ کا کچھ حصہ ڈھا کر اپنی پسند سے پاں گوجو کی باہمی مدد سے تعمیر شروع کروائی۔ پھر لوئی شیز دہم لوئی چہار دہم نے محل کو نادر نمونوں سے بھر دیا۔ دنیا کے عجوبات کے نادر نمونے جو آپ کو نظر آئیں گے وہ سارا انتخاب لوئی خاندان کے مرہون منت ہے۔ ۱۰ اگست ۱۷۹۳ء میں اس کو آرٹ گیلریوں کی شکل دی گئی اور سیاحوں کے لیے ان نوادرات کے خزانے کا دروازہ کھول دیا گیا۔ بہت سے نایاب نمونے مختلف ملکوں کی فتح کے بعد نپولین کے مرہون منت یہاں لائے گئے۔ ۴۰۰ کے قریب کیسٹلاگ موجود ہیں جس میں گریسی رومن اور اورینٹ شاہی خاندان کے نوادرات جو اب عنقا ہیں موجود ہیں۔

محل کا کچھ حصہ ہنری دوم نے بنوانا شروع کیا۔ ہنری کی موت کے بعد ہنری کی بیوہ کرسٹینا ڈی میڈیچی نے آرکیٹیکٹ فلبرٹ کی مدد سے اس محل کو میوزیم میں تبدیل کر دیا۔ بہت سے برآمدوں سے بارہ دریاں اس محل میں بنوائی گئیں۔ سنگ مرمر کی محرابیں ستون بنوائے گئے۔ ہنری کے زمانے میں مغربی حصہ بنوایا گیا۔ لوئی پنجم نے اور لوئی سیز دہم نے مجسمے رکھوائے۔ گریک میتھالوجی اٹالین آرٹ کے نمونوں کے ڈھیر لگا دیئے گئے۔ ایک زمانے تک یہ پرانا لوغ کہلاتا رہا۔ ۱۶۸۲ء میں اور ۱۷۵۰ء میں پھر کچھ حصے مسمار کر دیے گئے اس زمانے میں ۱۷۸۹ میں ۱۶ اکتوبر کو خواتین بیدار ہوئیں۔ عورتوں نے آزادی کے لیے مارچ کیا فرانسیسی عورتوں نے مجبور کیا کہ نپولین کا خاندان فرانس میں رہے اور کچھ افراد کو اٹلی چھوڑنا پڑے سوائے نپولین کی ماں کے۔ میوزیم کا فورتھ ونگ نپولین کے زمانے میں بنوایا گیا:

چارلس دی وائز کے زمانے میں قیمتی لائبریری اس میں محفوظ کی اور ۱۶ ویں صدی میں یہ

عمارت مستقل طور پر میوزیم میں تبدیل ہوئی۔ ہنری چہارم نے پیلو میں ڈی فلور بنوایا۔ لوئی شیز دہم اور لوئی چہارم دہم نے مجسموں کے ڈھیر لگا دیئے جو کہ اب پرانا لوغ کہلواتا تھا جسے شاہی محل ویقصائی کا نام دے کر ۱۶۸۲ء میں بدل دیا گیا۔ لوغ میوزیم تین منزلوں میں بنا ہوا ہے۔

پہلی منزل پر مصری مصوری یونان وروما کے فنکاروں کے مجسمے نوادرات اور تعمیراتی نمونے مشرقی فن کے نمونے اور دوسری بڑی منزل پر نقاشی اور مصوری اور پینٹنگ کے حسین ترین شاہکار بڑی بڑی دیواروں پر آویزاں تھے۔ اتنے بڑے بڑے ہال چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بڑے بڑے آرٹسٹوں کی پینٹنگس آویزاں تھی۔ لندن میں اگر آپ نے ٹیٹ گیلری دیکھی ہے تو آپ کو اندازہ ہوجائے گا تصویریں لگانا کتنا مشکل کام ہے۔ پیرس سجاوٹ کا گھر ہے۔ ایسی نفاست وقرینے سے ہر چیز سجائی جاتی ہے۔ رنگوں کا انتخاب پھر بڑی چھوٹی تصویروں کو پوری پوری بڑی دیواروں پر آویزاں کرنا بھی آرٹ ہے۔ ایسی جاذب نظر ہوں کہ لوگوں کی نگاہ پینٹنگ پر ہی مرکوز رہیں۔ روشنی کا انتظام بھی قیامت کا ہے۔ ہر طرف سے کھڑے ہوکر دیکھو تب بھی آرٹسٹوں کی تصویر کے وہ پہلو ضرور اُجاگر ہوتے ہیں جہاں آرٹسٹ کا کمال نظر آتا ہے اس میں۔ روشنی لگانے والوں کے ساتھ ضرور کوئی آرٹسٹ بھی ہوگا۔ چوری سے محفوظ رکھنے کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ پورے میوزیم میں سارے ہال میں مدھم روشنیاں منور ہیں۔ چھتوں پر ایسے نقش ونگار ہیں رنگین پینٹنگ کے بال میں کی گئی ہیں۔ چھتوں پر قیمتی فانوس منور ہیں۔ تصویروں کے چہروں پر ایسا نور ہے جیسے آسمانی دنیا سے مصور آئے اور ایسے حسین چہرے بنا کر چپکے سے چلے گئے۔ اتنے بڑے بڑے ہال جو دنیا بھر کے سیاحوں سے کھچا کھچ بھرے ہیں، کیمروں سے تصویریں کھینچ رہی ہیں مگر سب خاموش ہیں، ایسے باادب۔ بیچ وبیچ مخمل کی سُرخ ہری کرسیاں اور مخمل کے چبوترے بنے ہیں کہ آپ اگر تھک جائیں تو چپ چاپ بیٹھ جائیں۔ لوغ کی سیڑھیاں چڑھتے ہی ہر راستہ آپ کو ایسے کھینچتا ہے اپنی باہیں پھیلائے آپ کو بلاتا ہے۔ میرا دل بھی میرے قابو میں نہیں تھا۔ پہلے مونا لیزا، وینس، اپالو یہ سب دیکھ کر۔ اور کہیں ٹوٹے ہوئے ستون جو راستوں میں آتے آتے مسافت کی ضربیں نہ سہہ سکے۔ جو کچھ حصے بچے وہ انہوں نے بڑی مشکلوں سے جوڑ جوڑ کر نصب کردیئے۔ مجسموں اور پتھروں

کے چہرے، انسانی جسموں کے حسن کو مصور نے جب پتھر میں سمویا تو مجھے خدا یاد آیا۔ انسانی ہاتھ انسانی دماغ میں اللہ میاں نے حسن کے خزانے چھپا رکھے ہیں۔

کیسے لوگ تھے پہلے زمانے کے اپنی زندگی کا مقصد پیدا ہونے کا جرمانہ ادا کر گئے۔ تصور جاناں میں زندگیاں گزاریں۔ کام کرتے نہیں تھک جاتے تھے۔ اپنے پیچھے محل نہیں چھوڑے صرف اپنا نام ان فن پاروں کے ساتھ چھوڑ گئے جو میں عینک لگا لگا کر لوغ کی مدھم روشنی میں ہر مجسمے کے ساتھ لکھا ہوا نام اور تاریخ پڑھ رہی تھی۔ اور ہم ایسے کہ کچھ بھی نہیں کیا۔ اب تک زندگی کشکول پر نثار کر دی اور خالی چھلنی جھولی کی تجھ مجھ پر لیے چپکے سے چلی جاؤں گی۔ کیسے باوقار لوگ تھے۔ اپنے اندر کا حسن پتھروں میں تحلیل کر گئے۔ جو آج تک موجود ہے زندہ جاوید رہے گا۔
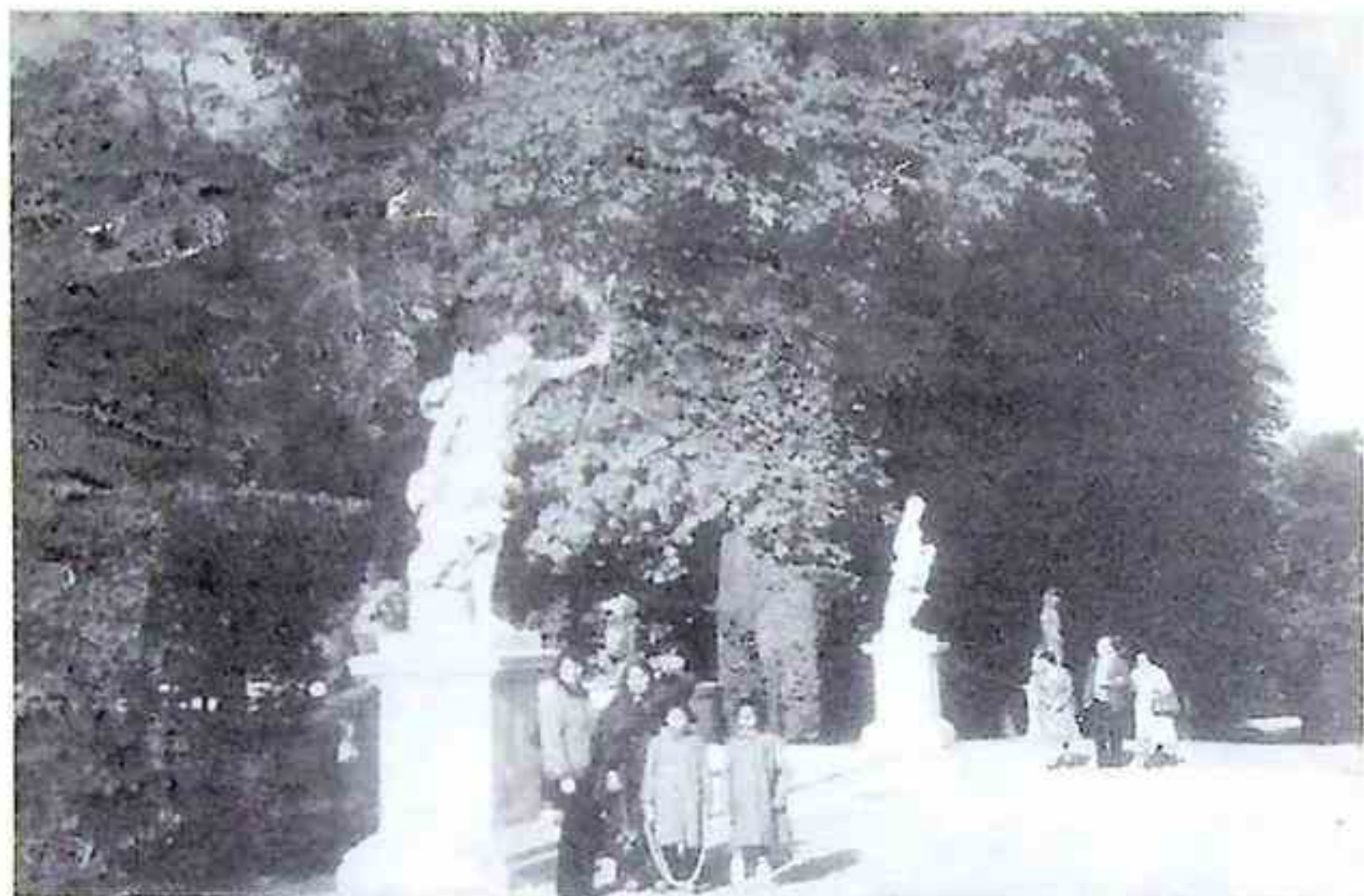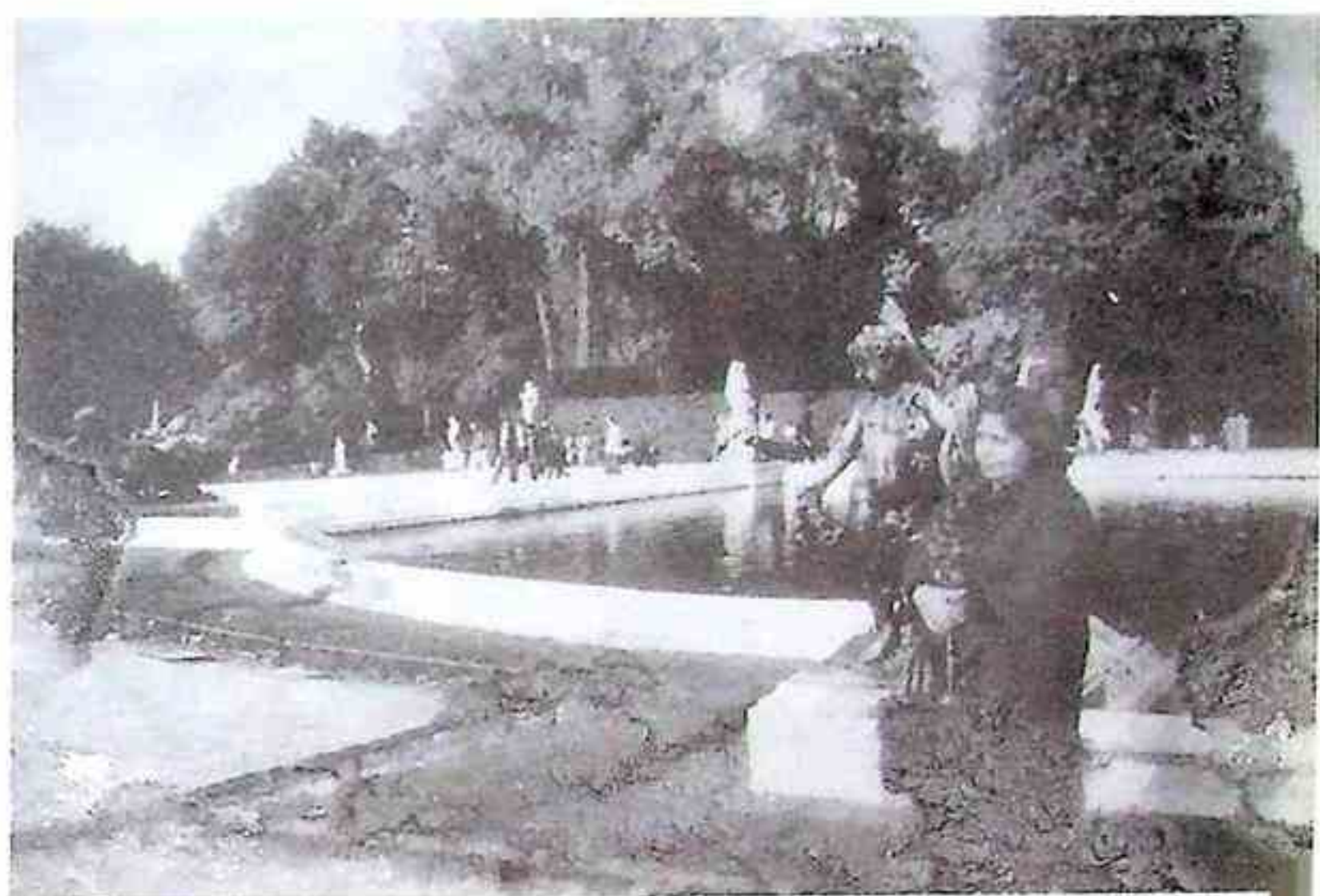
آرچ آف ٹرائیمف

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

لوغ کی سیڑھیوں پر ایسی خوبصورت دھوپ ہے۔ میرے اندر بیٹھی ہوئی خاتون اکثر مجھے اکساتی رہتی ہے اگر میں اس کی سن لوں تو اب تک میری تکا بوٹی ہوگئی ہوتی۔ سارے باغ پر دھوپ پڑ رہی تھی اور میں ابھی ابھی وین گاگ، گوگان، دیگاش، رینوا کی پینٹنگ دیکھ کر آئی ہوں۔ اصلی پینٹنگ جس کے پرنٹ ہم اپنے ملکوں میں سنہری فریموں کی زینت بناتے ہیں، لندن اور یورپ گھومنے سے معلوم ہوا کیسے کلیجے سے وین گاگ کی پینٹنگ کی نقلی پرنٹ ہم اپنے ڈرائنگ روم میں لگاتے تھے۔ قائداعظم کی قد آدم تصویر کے پاس۔ اور یہاں سڑکوں پر بچاس پنس اور تیس پنس میں ریڑھیوں پر بھرے پڑے ہیں مونا لیزا، آپالو (Apollo) سب ٹکے سیر بک رہے ہیں اور کچھ سیاح جوڑے سیڑھیوں پر لیٹے آئس کریم کھاتے تھکن اتار رہے ہیں۔ سیاح اپنے نقشے کھولے راستے ڈھونڈ رہے ہیں کچھ جنوب مغربی پنسلوں کی لائنوں پر موڑ رہے ہیں۔ اونچے قطاروں میں کھڑے ہرے لباسوں میں درختوں کی شاخیں۔ سرخ نارنجی پتیوں میں پروئی ہوئی لمبی لمبی شاخوں کے درخت، دور لمبے درختوں کا جنگل اور دھوپ۔ آنکھیں اگر میچ کر

دیکھوں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے آگ کے شعلے سردی میں ٹھہر گئے اور درختوں کو چوم رہے ہیں۔ چمکیلی دھوپ میں سرخ آگ پھیلتی جائے گی۔ آسمان پر جذب ہو جائے گی۔ بڑے بڑے فواروں پر چھ باغ تقسیم کر دیئے ہیں۔ میں سب سے اوپر کی سیڑھی پر بیٹھی یہ سوچ رہی تھی کہ کیسے سلیقے سے یہ لوگ پھول اگاتے ہیں۔ پھولوں کی باڑوں کو کیسے تراشتے ہیں جیسے پھولوں اور باغوں کا حسن بھی ان کی تنظیم پر منحصر ہو۔ درختوں کو ایسے کاٹتے رہتے ہیں جیسے سب کے قد برابر ہوں سب کے جسم ایک طرح کے ہیں کوئی شاخ ذرا بھی بڑھتی نہیں کہ کاٹ دی۔ زرد نارنجی پتیوں کے ڈھیروں پر چلتے ہوئے سیاحوں کے جوتوں کی آوازیں لمبے لمبے شاہ بلوط کے درختوں کی قطاروں سے سورج چھن چھن کر ننھے بھاگتے ہوئے بچوں کے تازہ سیبوں جیسے چہروں پر صحت کا حسن بکھیر رہی ہیں اور خشک پتیوں اور بجری کی آوازیں لوغ کی سیڑھیوں پر ٹھہر گئیں۔

آخر کار میرے چہرے پر ضرور تیمی برس رہی ہوگی جو گائیڈ خود بخود رحم بھری نظروں سے مسکرایا۔ اور میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ ''کیا تم انگریزی جانتے ہو''۔ ''وی مدام۔'' ''مونا لیزا کدھر ہے''۔ پاس کھڑی آسٹریلین لڑکی نے محبت سے انگریزی میں بتایا ۱۹ گروپ میں پہلی منزل پر''۔ ''یہ کتاب کہاں سے ملتی ہے۔'' میں نے پوچھا۔ وہ جو لمبا کیو ہے سیڑھیوں کے الٹے ہاتھ پر وہاں کتابیں کارڈ اور تصویروں کے پرنٹ اور ریستوران ہے۔ پہلے وہ خرید لو تم کو مدد ملے گی۔ اور میں کیو میں لگ گئی۔ لمبی سی میز پر چار عورتیں تھیں۔ فرانس پر کتابیں میوزیم پر کتابیں۔ ۶ فرینک سے لے کر ۸ فرانک تک جوں جوں پیسے بڑھتے جاتے اور کتاب کی ضخامت بھی بڑھتی جاتی۔ بہت سی زبانوں میں کتابیں تھیں میں نے انگریزی میں خریدی۔ سب کچھ پتہ لگ گیا۔ کافی کی پیالی لے کر میں نے جلدی جلدی کتاب پر نشان لگائے۔ پہلی منزل سے شروع کریں۔ شروع سے پینٹنگ دیکھیں یا سب سے پہلے مونا لیزا؟ مونا لیزا سب سے پہلے دیکھتے ہیں سارا دن اپنا ہے۔ شام کے ۶ بجے تک دیکھ سکتے ہیں۔ اتوار ہے اس لیے مفت۔ اف کیا کچھ دیکھوں گی۔ مونا لیزا جو عمر بھر دیکھنے کی خواہش تھی وہ آج پوری ہوئی۔ اور آخر کار میری حماقت بھی تو دیکھیے کہ فرنچ بولنی آتی نہیں اور کوئی ساتھی نہیں اور میوزیم میں آ گئی۔ فرانسیسی گائڈ ضرور انگریزی تو جانتا ہوگا۔ سنگ مرمر کی سیڑھیاں رنگین جسموں سے بھرتی جا رہی تھیں دنیا بھر کی

تو میں مونالیزا کو دیکھنے کے لیے سیڑھیاں منٹوں میں طے کررہی تھیں۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ انسانوں کا ایک دریا تھا جو سیڑھیوں پر بہہ رہا تھا۔ سر ہی سر تھے۔ یہ سب مونالیزا کو دیکھنے جارہے ہیں۔ کونے میں کھڑی ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ پھر وہی لمبی چوڑی انسانوں کی جوڑی کیمرے اسٹینڈ اٹھائے چلے آرہے تھے۔ اسٹینڈ کی لمبی لمبی ٹانگیں پھر سے میرے کوٹ میں اٹکنے والی تھیں کہ ہم تینوں ہنس پڑے۔ پاردون۔ فرانسیسی لہجے میں اس نے راستہ مانگا۔ یہ کیوں میری تصویر نہیں کھینچ دیتا۔ دل میں سوچا ہی تھا کہ وہ چائنیز جاپانی نما انسان کیمرے سے کھٹا کھٹ تصویریں کھینچتا ہوا چلا آرہا تھا۔ اے کاش یہ میری تصویر لوغ میں کھینچ دے تو کتنا اچھا ہو۔ وہ بھی تنہا اور بے زبانی کا شکار تھا۔ نیلا سوٹ پہنے چپ چاپ بے نیاز سا، شریف میاں اور محبت کرنے والا باپ بھی لگ رہا تھا۔ قیمتی کیمرہ اور بہت ہی بڑھیا لینس گلے میں لٹکائے ہوئے تھا۔ کئی بھاگتے ہوئے بچوں کی درختوں کی قطاروں کے بیچ میں کھڑے ہوکر تصویریں کھینچ رہا تھا جس سے احساس ہوا کہ تصویر اچھی کھینچتا ہوگا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا اور بے ساختہ میرے منہ سے نہ جانے کیسے اتنے سارے الفاظ نکل گئے۔ تم میری تصویر مونالیزا کے پاس کھینچ دو اس لوغ کے صدر دروازے کے پاس کھینچ دو۔ یہ فرانسیسی پیسے میرے پاس ہیں لے لو میں اپنا کیمرہ لندن میں بھول آئی ہوں۔ کیا کسی کو بتاؤں گی کہ میں پیرس گئی تھی۔ میرے ہاتھوں میں ۱۰۰ فرینک کا نوٹ دیکھا اور ہنس دیا۔ نہیں نہیں وہی مسکراہٹ جس میں عجز تھا اور سر سے انکار کردیا۔ پھر مجھے غور سے دیکھا میں نے جلدی سے اس کو اپنے ہاتھ کی انگوٹھیاں دکھائیں اور جیسے اسے اطمینان ہوگیا۔ میں سنگاپور سے آیا ہوں انجینئر ہوں۔ بہت مصروف ہوں اگر تصویر لے بھی لی تو تمہیں کیسے دوں گا۔ میں آج شام جارہا ہوں۔ کئی ملکوں کے بعد سنگاپور پہنچوں گا۔ بے کار ہے تھینک یو، تھینک یو۔ اور وہ چل پڑا۔ اور چپکے سے اندر کی خاتون نے کہا بڑی بکی ہوا اجنبی سے اتنی بڑی فرمائش۔ نہیں ڈر گیا۔ شریف آدمی ہے نا اور میں نے بھی سیڑھیوں پر چڑھائی شروع کردی۔

تو اس آنچل کا اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

(مجاز)

یہ پینٹنگ دیوار پر آئل کلر میں بہترین پینٹنگ ہے۔ اس پینٹنگ کو دیکھ کر میں بھی چپکے سے فرانس کے دوسرے حلقے کے سوچنے والوں کے ساتھ چلی جارہی تھی۔ خون وفسادات سے اب طبیت لرزنے لگی ہے۔ اپنی زندگی میں اتنے فسادات دیکھے کہ اب سڑکوں پر بہتے ہوئے خون نہیں دیکھ سکتی۔ ۱۸۳۰ء لوگوں کو لبرٹی کی راہ دکھا رہا ہے۔ آزادی پر مجھے مجاز یاد آئے۔ فرانسیسی عورت نے میدانِ جنگ میں قدم رکھا۔ ہتھیار پھینک دو۔ جنگ بند کرو۔ ماؤں کی گودیں خالی ہورہی ہیں۔ یہ تصویر دیکھتی رہی اور مجھے اس تصویر کے سرخ و کالے رنگوں میں سے تازہ خون بہتا ہوا نظر آنے لگا۔ مردہ جسم کی بو آنے لگی۔ آوازیں چیخوں میں تبدیل ہورہی تھیں۔ آگ کے شعلوں اور دھوئیں سے میرا دم گھٹنے لگا۔ بچاؤ! بچاؤ! فصیل کے پیچھے نکلس گارڈن باغ کے پھولوں کی پتیاں ہواؤں میں تیرنے لگیں۔ سبزی منڈی کی طرف کا آسمان سرخ دھوئیں میں چھپا ہوا تھا۔ روشنیاں چمکنے لگیں اور کھٹا کھٹ پینٹنگ کی چاروں طرف سے کیمروں سے تصویریں کھنچنے لگیں۔

اندر ہال میں جاپانیوں کا ایک گروپ دھڑا دھڑ آزادی کی پینٹنگ کی تصویریں اتار رہا
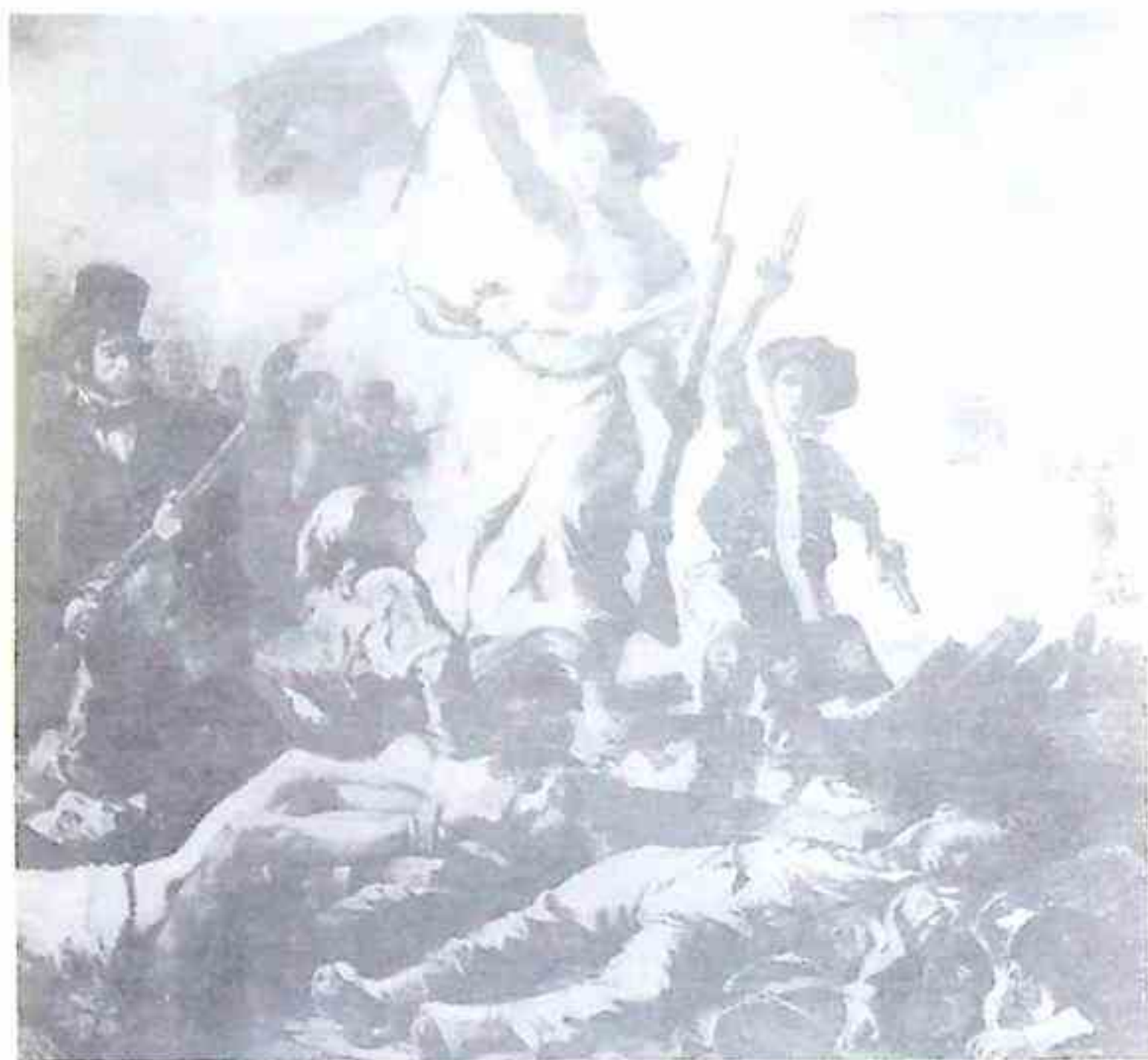
۱۸۳۰ کی بغاوت میں آزادی کی راہ دکھانے والے

مونالیزا کے بعد لیونارڈو دا ونچی کی دوسری مشہور پینٹنگ ۱۵۰۱ سے ۱۵۰۹ ورجن اور بچہ

پیرس کا مشہور ایفل ٹاور

تھا۔ عورتیں بے قرار ہو کر میدان جنگ میں نکل آئیں۔ ہمیں روٹی چاہیے، امن چاہیے، صلح چاہیے، جنگ بند کرو۔ ساری قومیں، ہر سیاح اس تصویر کے پاس آ کر ضرور رک جاتا تھا۔ اس کی بھی اتنی ہی شہرت تھی جتنی مونا لیزا کی۔ نپولین کا جشن تاجپوشی اور لبرٹی، کیسا جادو تھا جو ساری زندگی سوار رہا اور تصویر دیکھتے ہی اتر گیا۔ بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا۔

اتنی چھوٹی سی تصویر جسے دنیا گھیری کھڑی تھی کچھ بھی نہیں۔ لال مخمل کی چوکی پہ میں بیٹھی یہی سوچتے سوچتے کئی گھنٹے گزار گئی۔ وہ بوڑھو مدام والا لمبا تڑنگا جوڑا میرے قریب تھا۔ وہی کیمرہ اٹھائے دونوں لڑکے جو مجھے کئی دفعہ صبح سے مل چکے تھے۔ کیا تم میری تصویر مونا لیزا کے پاس کھینچ دو گے۔ وہ دونوں ہنس پڑے۔ میں دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ یہ بھی جاپانی کی طرح کہیں انکار نہ کر دیں۔ اللہ میاں نے لاج رکھ لی۔ اور سچ مچ انہوں نے میری تصویر اسی چھوٹی سی تصویر کے ساتھ کھینچ دی۔ ہالینڈ کے ان پال صاحب کا میں کس زبان سے شکریہ ادا کروں کچھ تھوڑی بہت انگریزی ان کی کام آ ہی گئی۔ اتنے سارے سے لڑکے۔ ایک دفعہ بھی نہیں سوچا کھٹا کھٹ تصویر اتار لی۔

فلورنشائن اٹلی کی ایک سیدھی سادھی دوشیزہ جو مونا کے نام سے پکاری جاتی تھی وہ اپنی سادگی، پرکاری سے لینارڈو ڈاونچی کا شکار بنیں۔ ۱۴۹۵ء میں فرانس کے ایک رئیس فرانسکو سے مونا لیزا کی شادی ہوگئی۔ جو بعد میں ''لاسونسوا'' کہلائے۔ لینارڈو خود ہی اپنے اس شاہکار پر فریفتہ ہو گئے تھے کہ جہاں جاتے اسے ساتھ لے جاتے۔ آخر کار یہ تصویر فرانس میں فرانسکو کو بیچ دی گئی۔ اس کے بعد اس تصویر کی شہرت ہوتی گئی۔ لوگ دور دور سے دیکھنے آتے۔ ۱۹۱۱ء میں لوغ میوزیم میں لگا دی گئی تھی جو وہاں سے چوری ہوگئی۔ دو سال کے بعد فلورنس کے ایک ہوٹل سے سولہویں صدی کی مونا لیزا کی تصویر ملی۔ افواہوں کی کہانیاں نئے نئے پہلو پیش کرتی ہیں کہ کئی اوریجنل تصویریں مختلف مقامات پر دیکھی گئی ہیں۔ ماہرین بھی حیران ہیں کہ اصل کون سی تصویر ہے۔ ایک ماہر آرٹسٹ کے سر اس خرابی کا سہرا ہے انہوں نے ابھی حال ہی میں قبول کیا ہے کہ انہوں نے کئی ایک مشہور تصویروں کی کاپی بنا ڈالی۔ مگر یہ اصلی پینٹنگ ہے۔ ایک سیدھے سادھے گاؤں کے پس منظر میں یہ حسین مونا لیزا جس کی مسکراہٹ میں سوچ افسردگی اور

پیار بھرا انتظار ہے۔ یہ لافانی حسن ہے اور لینارڈو ڈا ونچی کا شاہکار ہے۔ پیرس آپ کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ ریکارڈنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنے کان میں ریسیور لگائے یہ کمنٹری سن رہی تھی۔ تقریباً چھ پاؤنڈ خرچ کرے میں نے یہ ٹیلی فون نما پلاسٹک کا ریسیور کرائے پر لیا۔ جسے تصویر کے پاس کھڑے ہو کر سنا پڑتا ہے۔ جہاں تک قالین تصویر کے حد تک بچھا ہے آواز ریسیور میں آتی رہتی ہے۔ ٹیپ ختم ہو جاتا ہے۔ پھر شروع ہو جاتا ہے تاکہ آپ دوبارہ سن سکیں۔

لوگ ایمانداری سے ایک دفعہ میں ہی سن کر واپس کر آتے تھے۔ پھر مخمل کی چوکیوں پر بیٹھے تصویر دیکھتے رہتے اس حسن کی دیوی کو کچھ آڑے ترچھے رخ سے دیکھ رہے تھے کہ سنا ہے جس رخ سے بھی دیکھیں وہ اس تاثر کو لیے مسکراتی نظر آتی ہے۔ نیلی خوبصورت آنکھیں گل شفتالو رخساروں پر کھلائے ہوئے چھوٹی سی لڑکی بہت دیر سے میرے پلاسٹک کے ریسیور کو گھور رہی تھیں: بار بار کھلی کھلی نیلے کنچوں جیسی آنکھیں پوچھ چکی تھیں۔ تم کیا سن رہی ہو۔ یہ سارے لوگ کان میں اس ٹیلی فون کو لگائے نہ جانے کیا کہانی سن رہے ہیں پھر مونا لیزا کو گھورتے رہتے ہیں۔ اور میں نے سامنے میز پر بیٹھی اس لڑکی سے نظریں بچا کر جسے میں ریسیور ابھی واپس کرنے والی تھی چپکے سے اس لڑکی کے ہاتھ میں ریسیور تھما دیا۔ تم سن لو پھر اس لڑکی کو دے آنا۔ اور اس لڑکی نے ماں سے اپنی زبان میں کچھ پوچھا وہ زبان کسی آسمانی ملک کی تھی جو میں نے نہیں سنی تھی۔ اور سارا خاندان سر سے جھک کر اشاروں سے شکریہ ادا کرتا رہا۔ اور مجھے خوشی تھی کہ میں نے ۳ پاؤنڈ وصول کر لئے اور چہروں پہ بچی خوشی سچے رنگوں میں ڈوبی چرالی۔ اس ہاتھ سے حسن لیا اس ہاتھ سے چن لیا۔ تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا۔ اس مہنگے شہر میں میاں بیوی اور چار بچوں کے ساتھ سیر کرنا آسان نہیں۔ ابھی میں خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی احسان کر کے کہ بچی نے چپکے سے میرے ہاتھ میں ریسیور لا کر دے دیا۔ ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ کچھ میں نہیں آتا۔ ظاہر ہے ہم سب کی سمجھ میں آ گیا۔ ہم سب ہنس پڑے۔ میں نے تو انگریزی زبان کا ٹیپ خریدا تھا نہ جانے ان کی کون سی زبان تھی اور میں ریسیور اس لڑکی کو دے آئی جو سفید لال کالے نیلے ریسیور بیچ رہی تھی۔ جاپانی زبان، جرمن، اٹالین زبان کے کیبل لگے ریسیور ڈھیروں رکھے تھے۔

ایفل ٹاور جہاں بھی نظر آئے لوگوں کے ذہن میں پیرس کا نام چمکنے لگتا ہے۔ میزوں پر سگریٹ کی ایش ٹرے پہ رکھا ہوا، چابیوں کے گچھوں میں لٹکا ہوا، لڑکیوں کے گلے میں لٹکا ہوا اور میرے سامنے یہ اتنا اونچا سا جیسے قطب کی لاٹ جیسا کھڑا ایفل ٹاور جس کے نیچے دائیں بائیں میلوں لمبے پھیلے باغات جو لوگوں سے بھرے ہوئے ہیں کئی پھانکوں میں بٹ گئے ہیں۔ اس میں چڑھنے کے لیے لفٹ بھی ہے اور سیڑھیاں بھی ہیں۔ تین منزلیں ہیں۔ ہر منزل پر ایک ایک رستوران ہے۔ اتوار کو قرب و جوار کے فلیٹوں میں رہنے والے چائے کا سامان لیے جگہ جگہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ عورتیں ٹولیوں میں سرگوشیوں میں باتیں کرتی نظر آتی ہیں۔ خاموشی اور شور کا نام نہیں۔ میں عظیم عمارت کے سامنے آئس کریم کھاتے بچوں کو دیکھ رہی ہوں اور یہ سوچ رہی ہوں کہ فرانس، اٹلی، بیروت، مصر کی عمارتوں میں کتنی مشابہت ہے ان میں ایک اپنا امتیازی پن پرانے زمانے کا ملاپ ہے۔ ۱۰۵۰ فٹ اونچے ایفل ٹاور کو دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ لوہے کا بنا ہوا ہے۔ ضرور بھاری ہوگا۔ جب سے انسان نے لوہا، تانبا، اسٹیل اور میٹریل کو عمارت میں ڈھالنا شروع کیا تو نئے زمانے کے جدید رخ نے کمالات کو عروج پر پہنچا دیا۔ انجینئروں، آرکیٹیکٹوں کی نظر میں یہ بہت ہلکی پھلکی عمارت ہے۔

انجینئر ''گسٹو ایفٹ'' کا یہی کمال اس وقت سے اب تک کی دنیا میں ہندسوں کو حیران کر گیا۔ اس میں تقریباً ۱۵۰۰۰ میل کے ٹکڑے لگے ہوئے ہیں جن سے یہ جوڑا گیا ہے۔ جس کا نہ یقین میں آنے والا وزن ۷۰۰۰ ٹن ہے۔ سیمنٹ میں نیچے بھی کچھ حصہ پیوست کیا گیا ہے۔ یہ کل تین حصوں پر مبنی ہے۔ پہلا حصہ ۱۸۷ فٹ، دوسرا ۳۷۷ فٹ اور تیسرا حصہ ۸۹۹ فٹ کا ہے۔ اس کے ہر حصے پر شراب خانے، قہوہ خانے بنے ہوئے ہیں۔ تاکہ سیاح سارا پیرس جام و چائے کی پیالی ختم ہونے تک دیکھتے رہیں۔ اس کے چاروں طرف ۴۵ میل چاروں طرف سبزہ زار ہے جو نپولین کے زمانے میں فوجی کارزار تھا۔

دِل فسردہ میں پھر دھڑکنوں کا شور ہوا

دِل فسردہ میں پھر دھڑکنوں کا شور ہوا
یہ بیٹھے بیٹھے مجھے کن دنوں کی یاد آئی
پھر اس کی یاد میں دل بے قرار ہے ناصر
بچھڑ کے جس سے ہوئی شہر شہر رسوائی

صبح سے یہ شعر میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہے۔ موسم اُداس ہے میں اداس ہوں کھڑکی کے نیچے مونیک کی گاڑی نیچے سڑک پر رینگ رہی تھی۔ بارش کے ڈھندلے باریک پردے کے پیچھے سارے بازار کے نقش دھندلے پڑ گئے۔ ساکت بھیگے درختوں کے گھونگھٹ میں جلتے بجھتے سڑکوں پر لگے لیمپ بھی بڑے زرد پھیکے لگ رہے تھے۔ سامنے دکانوں پر سُرخ زرد روشنیاں برابر منہ چڑا رہی تھیں اور میں اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس کھڑی نیچے سڑک پر جاتی اپنی محسنہ کی گاڑی مڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

کیسے اچھے اچھے لوگ اللہ میاں نے پیدا کیے اگر مونیک مجھے آج لوغ میوزیم میں نہ ملتی تو میں آج گھر نہ جانے کیسے پہنچتی۔ اپالو کا مجسمہ نہ دیکھتی۔ مائیکل اینجلو کا بنایا ہوا یہ دوسرا مجسمہ

''قیدی'' بھی کمال کا تھا۔ جسم کے حسین خدوخال پتھر سے تراشے گئے۔ یہ اس دیوانے آرٹسٹ کا ہی تو کمال تھا۔ یہ دونوں مجسمے فرانس کے ہنری دوئم نے ۱۵۵۰ء میں فلورانیٹائن لائے۔ روبرٹ اسٹوزین نے ریولیشن کے زمانے میں لوغ میوزیم میں لائے تھے۔ ابھی میں یہ پڑھ رہی تھی کہ اسکیچ کرنے کی آواز پر میری نگاہیں مونیک پر پڑیں۔ جو اپنی اسکیچ بک کھولے دنیا سے بے خبر اپالو کے مجسمے کو اسکیچ کر رہی تھی۔ پنسل کاغذ کی چھاتی پر ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔ میری نگاہیں تصویر پر تھیں۔ میں سمجھتی تھی یہ بھی انگریزی نہیں جانتی ہوگی۔

کیا تم آرٹسٹ ہو؟ بے ساختہ انگریزی زبان میں میں نے پوچھ لیا۔

''نہیں۔ بالکل نہیں، ویسے ہی پینٹنگ کر لیتی ہوں۔''

میری تو عید ہوگئی۔ کافی دیر میں مجھے اس کی انگریزی سے یہ پلے پڑا کہ وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔ مجھے وہ گھر پر چھوڑ دے گی اپنی گاڑی میں۔ اتنی مہربان عورت جس کو میں صرف دو منٹ ملی اور راستہ پوچھا۔ جتنی بھی اسے انگریزی آتی تھی اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

شاید میرے اندر چھپا ہوا خوف اس کو میرے چہرے پہ گھبراتا ہوا نظر آیا جو اسے رحم آ گیا۔

اور ابھی ابھی وہ مجھے سارے شہر کی سیر کروا کر دریا کے کنارے آہستہ آہستہ ڈرائیو کرتی ہوئی مونیک گھر چھوڑ گئی۔ ان کی ایک بیٹی ہے اور دو بیٹے ہیں۔ ایک اسے بہت پیارا ہے۔ دو ملاقاتیں ہو چکی ہیں کل وہ مجھے اور فریدہ کو اپنے گھر چائے پر لے جائے گی۔ پرسوں میں نے اس کو پاکستان ایمبیسی میں ہونے والی پی آئی اے کے منیجر کی بیٹی کی شادی میں مدعو کر لیا ہے۔ تاکہ پاکستانی شادی کی تقریب دیکھ سکے۔ اب دیکھیے پیرس میں پاکستانی ایمبیسی میں شادی کی تقریب کیسی ہوتی ہے۔

''کیا تم پاکستان ایمبیسی ڈھونڈ رہی ہو۔''

اور میں حیران رہ گئی اسے کیسے معلوم۔ ذرا ڈری بھی، ''مجھے معلوم ہے کہ اس علاقے میں اکثر لوگ پاکستان ایمبیسی، پاکستان ایئر لائن ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔'' وہ جلدی جلدی میرے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے اطالوی لہجے کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی۔ اٹلی میں

کئی دفعہ جانے کے بعد معلوم ہو چکا تھا۔ اس طرح وہ مسلسل چل رہا تھا کہ وہ انالین انگریزی بول رہا تھا۔ ''سردی ہے، میں تمہارے سفارت خانے کے قریب کام کرتا ہوں۔ تم میرے ساتھ کافی پی لو۔ میں تم کو خود لے چلوں گا۔'' وہ میرے ساتھ چلتا گیا۔ کالے کوٹ میں سے گلابی قمیض چپکے چپکے چغلی کھا رہی تھی کہ صاحبزادے ضرور ویٹر ہیں۔ خیال کی پختگی سے میرے قدم اور تیز ہو گئے اور الٹے ہاتھ پر دوسرے موڑ پر پی آئی اے کا بورڈ ڈھونڈ رہی تھی وہ بھی تیز تیز چل رہا تھا۔ ''آؤ ایک کافی پی لو۔'' وہ مصر تھا۔ ''نہیں مجھے کافی پسند نہیں''۔ ''اوکے: کولڈ ڈرنک، فرنچ ریڈ وائن۔ تم کو کیا پسند ہے؟''

''کچھ بھی نہیں!'' وہ میرے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا۔ رُک رُک جاتا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ مجھے لگا جیسے بوری بازار میں لڑکا ازار بندوں کے فیتوں، سیفٹی پنوں کا لکڑی کا ڈبہ لیے میرے پیچھے بھاگ رہا ہے۔

''مرسی موسیو! بوژو مدام!'' میرے پاؤں سفید نرم گرم قالین میں چھپ گئے۔ پی آئی اے کی یونیفارم میں لمبی چوڑی ہڈیوں کے ڈھانچوں کے جسموں کو چھپائے دو حسینائیں ایک لال بال ایک کالے بال سر پر اوڑھے آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ایک حسینہ نے بننے کی سلائیاں نیچے ڈیسک میں کھسکا دیں۔ کندھے پہ لٹکے ہوئے دو پنوں کی پیٹیوں کو جو پنوں میں ٹنگے ہوئے تھے ٹھیک کیا اور ہم تینوں سوچ رہے تھے کہ کون پہلے بات کرے۔ یہ دونوں حسینائیں پی آئی اے والوں کو جلدی میں ملی تھیں شاید اور تجربہ اور فرنچ بولنے کی آسانی اُن کو ان سیٹوں پر بٹھائے ہوئے ہے۔

کراچی کے پی آئی اے آفس میں کئی مشرقی شکلوں کی لڑکیاں بڑی پیاری شکلوں کی لڑکیاں کاؤنٹر پر کام کرتی نظر آتی ہیں۔ اگر وہ فرنچ سیکھ لیں۔ پی آئی اے اگر یہ شرط لگائے تو ضرور پورے ملک میں ان خواتین سے بہت اچھی خوب صورت لڑکیاں ہمارے ملک میں ہیں۔ وہ کیوں نہیں اپنے ملک کا حسن مشرقیت معاشرت کی مظہر بن سکتیں۔ جب آپ ملک سے باہر ہوں تو آپ کا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کسی پاکستانی سے بات کریں۔ اطمنان سے اپنے ملک کے حالات معلوم کریں۔

ایک حسینہ نے ننھے منھے باریک دانتوں کی جھالر جو چوڑے نیلے مسوڑھوں میں جڑی ہوئی تھی پھیلا دی۔ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ سگریٹ، ٹھنڈ اور شب بیداری کی خرابی میں ڈوبی کھانسی اور تھکی آواز میں انہوں نے پوچھا اور جی چاہا، کہوں کہ زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے۔ کوئی پاکستانی ہے جس سے میں بات کر سکوں۔ مجھے ٹکٹ نہیں خریدنا...... اوہو.... کس سے ملنا چاہتی ہیں؟

کس سے ملنا چاہتی ہوں؟ کیا بتاؤں.. منیجر۔

افسوس وہ نہیں ہیں اس وقت۔ کوئی خاتون ہیں اس وقت؟ کوئی نہیں معاف کیجیے۔ اور میں چلی گئی۔ کاؤنٹر پر اگر ایک فرنچ خاتون رکھنا ضروری ہے تو ایک اپنے ملک کی انگریزی اور فرنچ بولنے والی سلونی سی خاتون بھی مل جائیں تو مجھے یقین ہے کہ جو حضرات مدت سے باہر رہتے ہیں وہ اگر ٹکٹ بھی نہ خریدیں تو اپنے ملک کے ایئر آفس میں جائیں تو طبیعت ضرور خوش ہو جائے۔

اپنے ملک کا دفتر اپنے ملک کے لوگ نظر آجائیں تو کبھی کبھی سچ مچ روحانی خوشی ہوتی ہے۔ جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے آپ بندہ نواز کیا جانیں۔ ''اغوا مدام۔ اغوا''۔ فرنچ میں خدا حافظ کو اغوا کہتے ہیں۔

چلو بی بی پاکستان ایمبیسی چلیں۔ لارڈ بائرن روڈ پی آئی اے کے آفس کے کونے پر مڑ جائیں سیدھے ہاتھ کی گلی پر کونے کی شیشے کی کھڑکی سے ایک سلونی پاکستانی حسینہ ٹائپ کی مشین سامنے سجائے پی آئی اے کی یونیفارم شلوار قمیض پہنے سگریٹ انگلیوں میں پکڑے بیٹھی تھی۔ سامنے ایک صاحب خالی پیالی رکھے سگریٹ سلگا رہے تھے۔ اونچی دکان پھیکا پکوان۔ کندھوں پر ٹنگے ہوئے دوپٹے جھونٹے کھا رہے تھے۔

بائرن روڈ پر پاکستان ایمبیسی دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ دہلوی صاحب مرحوم نے ایک کام بہت اچھا کیا تھا کہ ایمبیسی کی عمارت خرید لینے کے لیے بہت زور لگایا تھا اور ان کی فرانسیسی نژاد بیگم کا بھی ضرور اس میں ہاتھ ہوگا کہ اتنی اچھی جگہ فرانس کے دل کے قریب ہماری پاکستان ایمبیسی کے لیے خرید لی گئی۔ شانزے لیزے پر آرچ آف ٹرائمف کے بالکل قریب

پاکستان ایمبیسی ہے۔ مونیک نے کار پارک کی اور فریدہ دلہن بنی نکلی۔ لڑکیوں نے بھی پاکستانی گوٹے لگے غرارے پہنے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر چلتے ہوئے لوگ چند منٹ ضرور دیکھ لیتے تھے۔ سب خوش تھے اور میں دل میں ڈر رہی تھی کہ پاکستانی شادی میں لے جا رہی ہوں۔ پی آئی اے کے منیجر کی بیٹی کی شادی کا ریسپشن ہے دیکھئے کیسے ہوتا ہے۔ مونیک کو ہم سب لے کر آئے ہیں اپنے ملک کے سفارت خانے میں اپنے ملک کی شادی کی رسومات دکھانے کے لیے وہ بھی اپنی طرف سے بڑھیا کپڑے پہن کر آئی تھی۔ ہیرے کا کالے لباس پر بروچ خاص طور پر لگا تھا۔ دروازے پر ایک صاحب لمبے چوڑے سوٹ پہنے کھڑے تھے کہ پیچھے سے یوسف صاحب مسکراتے ہوئے نکل آئے اور مجھے خوشی ہوئی کہ چلو کوئی تو ملا۔ عسکری اور نفیس سے ملیں گے۔ میں بڑی خوش تھی کہ داہنے طرف ہاتھ بڑھا کر یوسف صاحب نے کہا کہ عورتیں اس طرف ہیں۔

کرسٹل کے خوب صورت شینڈیلیئر بھی مجھے مدھم لگے۔ چلو عورتیں اور مرد الگ الگ ہیں۔ بے چاری مونیک کیا سمجھے گی۔ خیر آنسو پونچھ گئے۔ مقصود صاحب کی بیٹی بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ ہماری دلہنیں بڑی خوب صورت ہوتی ہیں دلی خوشی ہوئی مجھے یہ دیکھ کر کہ دلہن کے سر پر گوٹے کرن کا دوپٹہ درست کرنے والی کا مدانی کی ساڑھی میں ملبوس نفیس تھی۔ میں شکر، دیکھتی رہی۔ کتنی پیاری نفیس کی شکل تھی دھنی جسم۔ ارے تم کو کیا ہوا نفیس! اور تم کو کیا ہوا سحاب۔ وہ بھی مجھے گلے لگتے ہی بولیں۔ وہی تھکا تھکا انداز بولنے کا۔ پان زردے کی گرم گرم خوشبو ننھے باریک دانتوں سے باہر قوام الائچی کے لپکے۔ عطر کی بھینی بھینی خوشبو۔ یہ سب نفیس تھی۔ ہمارے پیرس کے پریس اٹیچی کی بیگم نفیس اور عسکری۔ کئی برسوں کے بعد آج ان دونوں کو دیکھا۔ سفید بالوں کی بردباری کا بوجھ اٹھائے۔ عسکری ابن سعید۔ ان کی دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ پھر زمانے کے ستم یاد آئے۔ عینی کا ذکر رہا اور عسکری سے بات کرتے ہوئے مجھے اسماء طیب حسین یاد آئیں جن کے یہ چھوٹے بھائی ہیں۔ وہ اسماء جو مرزا احمد سعید کی سب سے ہونہار لڑکی ہیں جو پارٹیشن سے پہلے دلّی کی ایک بڑی سی ہری باڑروں والی کوٹھی میں رہتی تھیں جہاں موتیا اور رات کی رانی کے پھول کھلتے تھے۔ اندھیرے لان پر اندھیرے میں اور مونڈھے میں دھنسے ہوا ایک لڑکا اٹھا جو

سفید بنیان خاکی نیکر پہنے ہوئے تھا۔ عسکری ذرا نوکر سے کہو باہر شربت لے آئے۔ یہ وہ عسکری تھے۔

طیب بھائی جو اسما بھابھی کے میاں تھے وہ امی کے رشتے دار تھے۔ نجمی باجی کے دیور اور اسماء ان کی دیورانی اور یہ پریس اٹیچی ان کی دیورانی کے بھائی جو ابھی ابھی بڑے مصروف تھے۔ یونیسکو کانفرنس سے آئے تھے جو معروف کے بہنوئی ہیں یہ ہیں سعید دہلوی ہمارے منسٹر۔ میں دلّی سے واپس آ گئی۔ جلدی سے عسکری مجھے سعید دہلوی اور بیگم دہلوی سے ملوا رہے تھے اور میرا جی چاہا کہ کہوں، آپ کے والد نے بڑا ہی نیک کام کیا ہے کہ یہ ایمبیسی خرید گئے ورنہ اس جگہ کے نہ جانے کتنے پیسے کرائے کے دینے پڑتے ہمارے ملک کو۔ لندن کی ایمبیسی آج تک نہیں خریدی گئی۔ اتنا کرایہ دیا جا چکا ہے کہ کئی اور عمارتیں خرید لی جاتیں اب تک۔

پاکستان کا سفارت خانہ بڑا خوب صورت ہے۔ مونیک تعریف کیے جا رہی تھی ہماری خواتین کے کپڑوں کی اور زیوروں کی۔ چائے پر میں نے سموسے ضد کر کے دیئے کہ یہ خاص پاکستان کی چیز ہے۔ اس نے تھوڑے سے کھا کر پلیٹ میں اپنی رکھ دیئے۔ میں نے چپکے سے جب لے کر کھایا تو چودہ طبق روشن ہو گئے یا تو پاکستان سے آتے آتے خراب ہو گئے یا گرمی میں کہیں رکھے رہے۔ اتنے سارے سموسے خراب ہو گئے۔ تصویریں کھنچواتے ہوئے حال کے اندر بالکل ہی نہیں محسوس ہوا کہ اس ہال کے باہر پیرس ہے۔

دولہا دلہن بڑے خوب صورت لگ رہے تھے حاضرین بھی برے نہیں تھے۔ فریدہ نے لقمہ دیا۔ یعنی ہم لوگ بھی۔ مونیک بڑی خوش تھی کہ فریدہ فر فر فرنچ بول رہی تھی۔ ساری شام اس کی سوشل سروس میں گزری، پندرہ سولہ فرنچ کی طالبات جو پاکستان کے مختلف علاقوں سے فرنچ کورس کرنے آئی ہوئی تھیں بڑی خوش تھیں کہ دو مہینے کے بعد پاکستانی کھانے کی چیزیں ان کو ملیں اور اپنے لوگ بھی۔ پشاور کی خوب صورت لڑکی جن کے والد خود سفیر ہیں اٹلی میں۔ ان کو اور عذرا کو ہم نے مونیک سے ملوا دیا۔ وہ ان کو اپنے گھر بلائے گی تا کہ ان کی فرنچ برش اپ ہو جائے اور میں چپکے سے گنگنا رہی تھی۔

آنکھ کھل جائے تو تنہائی کا صحرا دیکھوں

آج ۱۶ نومبر ہے۔ پیرس میں رات کے ایک بجکر ۲۲ منٹ ہوئے ہیں۔ بارش کی بوچھاڑ نے مونیک کی چھوٹی سی گاڑی کو بھی اولوں کے ساتھ توڑ موڑ دیا تھا۔ اپنے گیلے کپڑے اتار کر فرنچ کافی پی رہی ہوں۔ آج کی شام بڑی خوبصورت گزری۔ اتنی ڈھیر ساری نعمتیں اللہ نے میری گود میں بھر دیں۔ مونیک کی ماں کے گھر کھانا تھا، چائے مونیک نے اپنے گھر پلائی۔ صبح آٹھ بجے سے بے چاری گاڑی چلا رہی ہے ہم سب کو ورسائی لے گئی تھی۔ پیرس سے کئی میل دور ساؤتھ ویسٹ جہاں ۱۶۲۴ میں کبھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جسے لوئی سیزدہم نے ایک شکار کی جگہ تجویز کی تھی۔ پھر وہ ۱۶۹۰ء میں اس محل کی صورت میں بڑھتا گیا اور ہنری کے زمانے میں ایسا عظیم الشان محل بن گیا کہ آج تک دنیا کے سیاح اس کی زیارت کیے بغیر نہیں جاتے۔

سیمون بوئیرے فرانسیسی ادب کی عصمت چغتائی ہیں انگلیوں پر اگر نام گنے جائیں تو سیمون بوئیرے کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کی عمر اس وقت ساٹھ ستر کے لگ بھگ ہے کاش مونیک کو زیادہ انگریزی آتی یا مجھے ہی فرنچ آتی۔ کئی دفعہ یہ ننی سی ڈکشنری جس میں فرنچ اور انگریزی زبان کی نقل ہے مجھے بڑی زہر لگتی تھی۔ ایک ننھا سا لفظ ڈھونڈنے کے لیے گھنٹوں صفحے الٹے پلٹے جا رہے ہیں پھر کہیں جا کر لفظ کی فہم کا اشارہ نظر آتا۔ جیسے اردو انگریزی

مونیک کا کمرہ۔ اس کے ہاتھ کی پینٹنگ
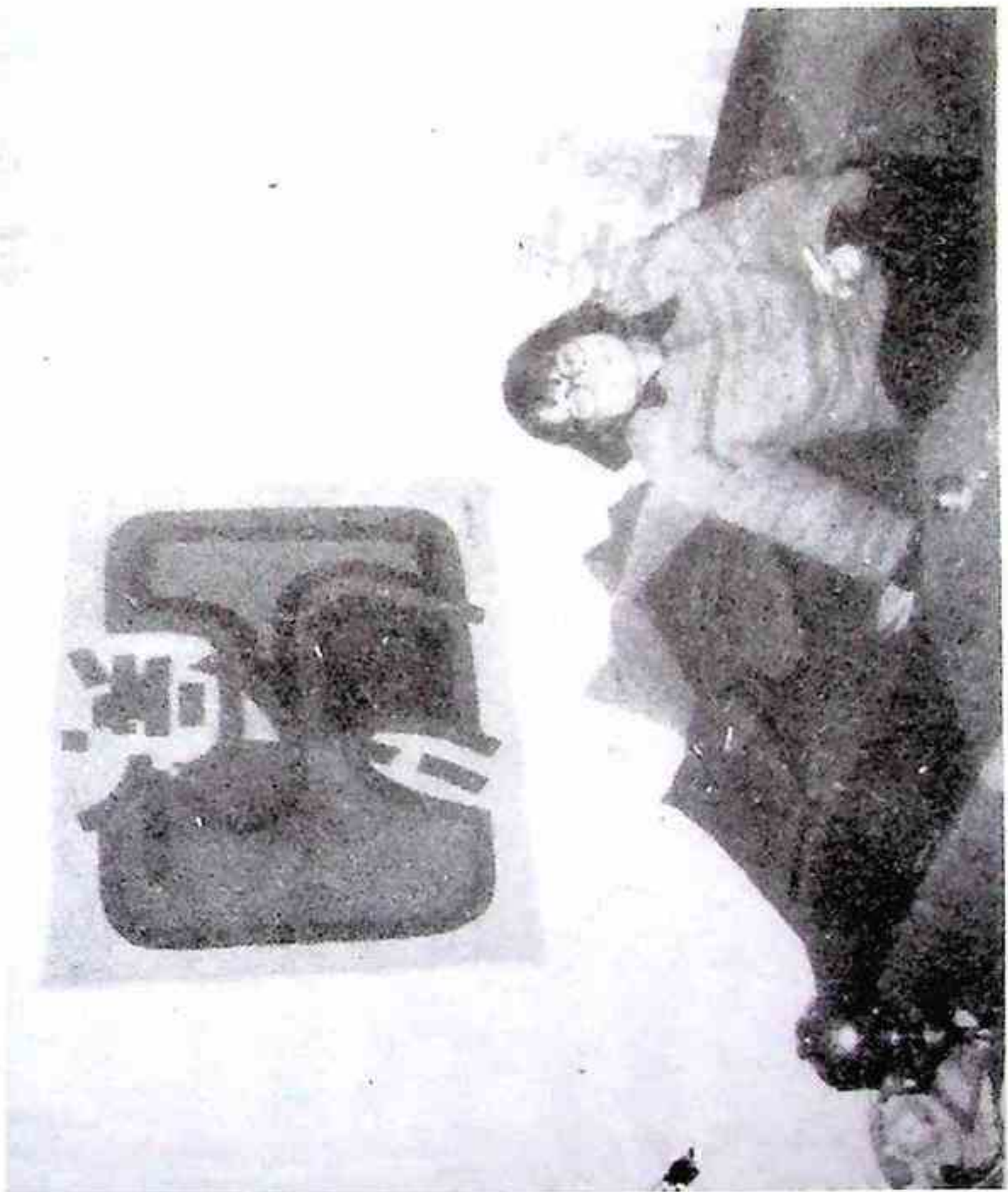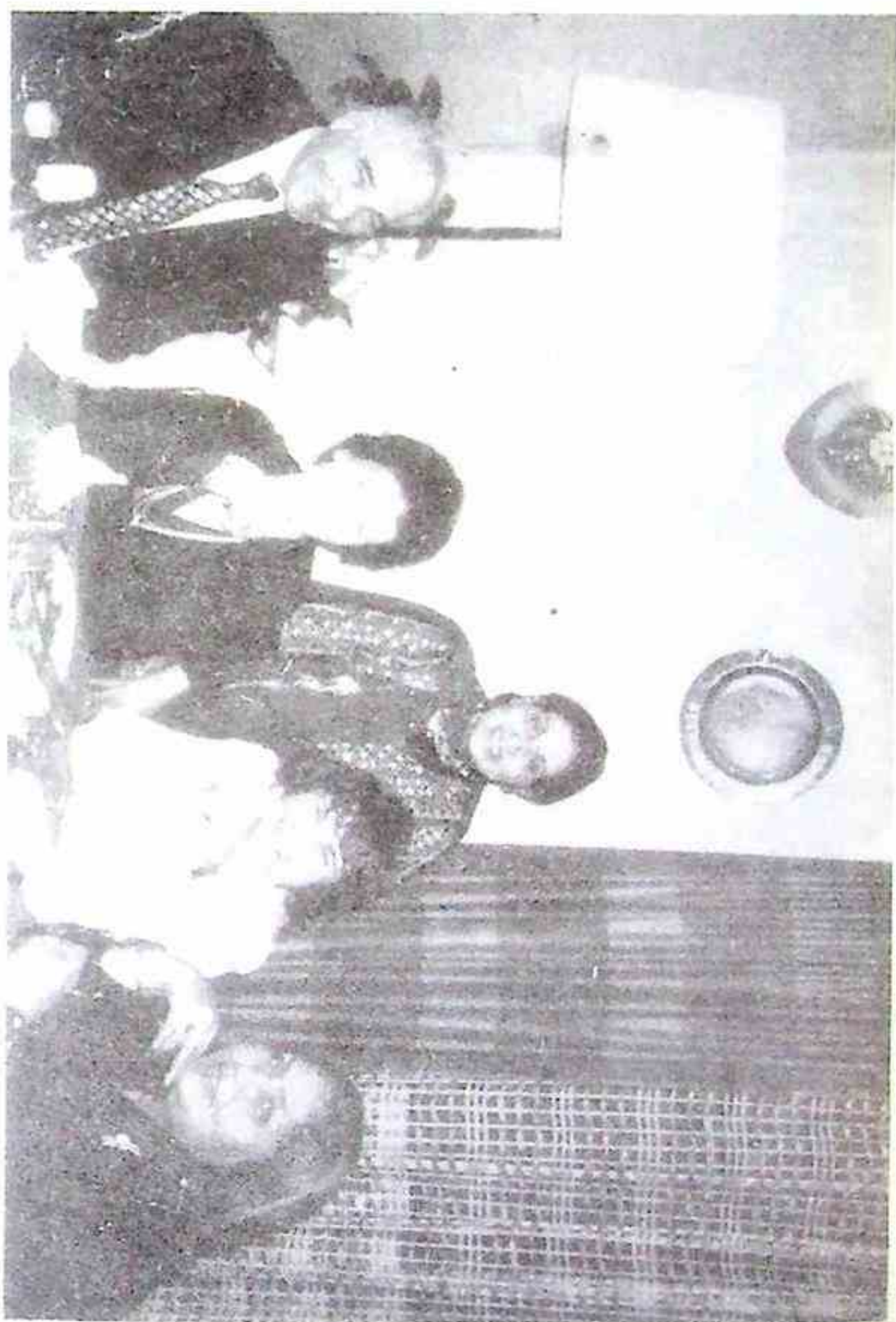
کی لغات میں بابائے اردو شدت سے یاد آئے ویسے ہی اس ننھی سی ڈکشنری کے مصنف کو ڈھونڈنے کو جی چاہا۔ آخر کار مونیک نے چھوٹا سا لفظ دکھایا تو پتہ چلا مجھ کو اینٹیک مارکیٹ میں لے جانا چاہتی ہے۔ ''کیونکہ سیمون بوئیرے نے کہا تھا کہ تم کو اس بازار میں پرانے سامان کی قیمت زیادہ سے زیادہ ملے گی چاہے اس لکڑی کے فریم میں دیمک اپنا گھر بنالے اور ہزاروں سالوں کی تہیں ان پر چڑھ جائیں ان کی قیمتیں بڑھتی جائیں گی جوں جوں یہ پرانی ہوتی جائیں گی۔ مگر صرف عورت ایک ایسی چیز ہے کہ اس کی قیمت لڑکپن سے جوانی تک اونچی سے اونچی ہوتی جاتی ہے اور بڑھاپا اس کو گراتا ہی جاتا ہے۔ یہ صرف عورت کے زوال کا زمانہ ہے ورنہ پرانے سے پرانے لکڑی کے فریم کی قیمت لاکھوں میں بدل جاتی ہے۔ یہ مقولہ اسی بازار کے ماتھے پر لکھا ہے۔ ہمارے ملک کی یہ مشہور لکھنے والی ہے۔'' فلی مارکیٹ جسے پیرس کا دروازہ بھی کہتے ہیں فورتھ پیرس میں ''پوخست وانسقا'' میں ایک بہت ہی خوبصورت نوادرات کی مارکیٹ ہے جو پیرس میں ۱۵ میٹر لمبی مارکیٹ ہے جو بہت مشہور معروف اور مہنگی ترین ہے۔ مجھے تو اس میں سب سے خوبصورت ایک گلی لگی جس میں اٹھارویں صدی سے لے کر جدید زمانے تک کی گڑیاں رکھیں ہیں۔ چھوٹی بڑی میرے قد سے لے کر انگشت کے برابر تک کی۔ ایک ننھی منی سی گڑیا چھینٹ کا لمبا فراک پہنے اور سر پر رومال، باندھے اپرین پہنے انڈے کی ٹوکری اٹھائے اسپتال سے نکل رہی تھی۔ میں نے قیمت پوچھی جو فرانسیسی میں لکھی تھی مونیک نے کندھے اچکا کر منہ بنا کر غ کی تختی میں غنغنا کر کہا ایک ہزار فرینک کے قریب۔ انگلی کے برابر گڑیا کی جب یہ حقیقت ہو تو وہ لکڑی کا فریم ۱۰۰ پونڈ میں برا نہیں تھا اور ہم نے ننھی منی گڑیا کو چپکے سے مسہری میں لٹا دیا نہ جانے کتنے سالوں سے لالٹین اٹھالیے انڈوں کی ٹوکری اٹھائے اسپتال میں بھاگی جارہی تھی کچھ دیر آرام کرلے اس مسہری میں جس کی قیمت چار ہزار فرینک تھی۔ ننھا منا سا چھپر کھٹ یہ سب ساز وسامان ہم نے اپنے اپنے گھروں میں بچپن میں دیکھا ہے جسے مونیک نے سچ سمجھ کر یا جھوٹ جان کر گول کردیا۔ اس نے پوسٹر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ یہ لکھا ہے پرانے فرنیچر کے پیسے منہ مانگے دے سکتے ہیں بقول سیمون بیوریر کے جب ہمارے جسم پرانے ہوجاتے ہیں تو ہمارے ساتھی بہانے ڈھونڈتے ہیں ہمارے عیب سجا کر ایک لمبی چوڑی فہرست

بناتے ہیں اور جو غم ہم نے ان کو دیئے ان کی اطلاع آدھی عمروں میں ان کو ملی ہے تو بے چارے اپنے اپنے غم نوعمر جسموں میں بہانے چلے جاتے ہیں۔ صرف پرانے عمر رسیدہ جسموں کی کوئی قیمت نہیں تو باہوش خواتین اپنے جسم پرانے نہ ہونے دیں۔ اپنے ذہن اور جسم کو ان کی سرد مہری سے فریز کریں ان کے ٹھنڈے سکون کے تہ خانوں میں سے سکے جمع کریں کیونکہ صرف روپے کی گرمی ہی سے آپ زندگی کو نکھار سکتی ہیں۔ ہماری تہذیب پر فرانس کا رنگ بھی ہے۔ وہی نفاست ڈپلومیسی سب لکھنو کی تہذیب پر نثار ہے۔ انکار تو کریں گے مگر اس انکار میں تذبذب ہے یقین کا شائبہ بھی ہے پوری طرح انکار بھی نہیں اور ہے بھی۔ فرانس اور لکھنو میں سگی بہنوں جیسی مشابہت ضرور ہے منافقت اور دل دکھنے کے مناسب الفاظ خوبصورت لہجوں کی مٹھاس میں کڑوے گھونٹ آپ چپکے سے پی جاتے ہیں، تلخی بعد میں محسوس ہو تو ہو دوسرے میٹھے لفظ آپ کے حلق میں بھر دیئے جاتے ہیں۔ شکریہ لندن اور فرانس میں منوں کے حساب سے مفت ملتا ہے۔ جیسے پیگالے اور مولاروژ کے ہر نکڑ پر فرانسیسی حسینہ چلتے ہوئے مسافر کے ساتھ فٹ پاتھ پر اپنے بٹے ہوئے حصے تک بھاگی ہوئی جاتی ہے اور راہگیر کا شکریہ اٹھائے واپس آجاتی ہے کبھی کبھی یہ بھٹکے ہوئے راہ گیروں کی دور خضر راہ بھی بن جاتی ہے۔ پیرس کا پگالے، مولاروژ سب ہم نے صبح کو بھری دوپہر میں باہر سے دیکھے کیونکہ ان نائٹ کلبوں کے چاروں طرف بازار ہی بازار ہیں۔ دکانیں کپڑوں سے ابلی پڑی ہیں یہاں پھرتے ہوئے بٹوؤں کو کلیجے سے لگائے رکھنا چاہیے اور میں نے بھی اپنی عورتوں کی ٹولی کے ساتھ بغیر پیسوں کے بٹوے کو کلیجے سے لگائے رکھا۔ رنگ اجلے تھے لباس اٹنگے تھے مگر بوہری بازار یاد آرہا تھا۔ شیفونوں کے تھانوں سے دکانیں بھری ہوئی تھیں۔ ٹشو، فرنچ پرفیوم، قسم قسم کے فیشن سے دکانیں مزین تھیں۔ مگر یہاں بلوچی مکرانیوں کے بجائے ٹرکشی الجزائر کے لوگ بھرے ہوئے ہیں جن کا وجود اتنا ہی جزوی ہے جتنا بلوچ اور مکرانیوں کا ہے جو کراچی کے جسم کا یک حصہ ہیں اٹالین اور جرمن چیزیں بھری پڑی ہیں۔ فرانسیسی تہذیب کی چیزیں آپ کو میڈلینڈ اوپرا ہاؤس کے پاس شروع ہوتے ہیں وہ بڑا پوش قسم کا بازار ہے ہمارے لندن کا بونڈ اسٹریٹ۔

کاروں کے رنگ تیز ہو گئے ہیں، بجلی کی روشنی درختوں میں سے چھن چھن کر زرد پھیکے

رنگ کی ہوگئی، شہر خاموش ہوتا جارہا تھا۔ معلوم ہوا صبح کے چار بج رہے ہیں۔ لندن کے ایک سرے پر گھر اور دوسرے سرے پر دفتر...... ایسٹ لندن اور نارتھ لندن ملنے سے مجبور...... تین بسیں بدلنی پڑتیں راستے میں تجارتی حصے کے بعد جس پر چپہ چپہ پر فیکٹریاں، دفتر، روپے پیسے کے بینک ہی بینک دنیا کے سارے ملکوں کے بینک...... چوروں ڈاکوؤں کے چھپے ڈھکے ٹھکانے...... قاتلوں کے خاموش گروپوں کے نہاخانے سب کچھ ایسٹ لندن کے قرب و جوار میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لندن کے بیچ میں حسین مقامات اگر میں روزانہ نہ دیکھوں تو پاگل ہوجاؤں بڑے بڑے پھولوں سے بھرے باغات...... ایسٹ لندن میں بہت سی کالینئن قوم رہتی ہے جو عام فہم میں نیشنل فرنٹ کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ کالٹینوں کی پٹائی قتل سب کچھ اس ہی علاقہ میں زیادہ ہوتی ہے۔ نیشنل فرنٹ کے ممبران اکثر و بیشتر ہاتھ کی صفائی کا کام دکھاتے رہتے ہیں۔ پولیس کی خبروں میں اگر آپ ریڈیو سنتے ہیں تو معلوم ہوتا رہتا ہے...... پھر اپنے اخبار نمک مرچ لگا کر بتاتے ہی رہتے ہیں مجھے دیکھو رات کے چار بج گئے اور نیند نہیں آرہی اور میں ایسٹ لندن کے گن گا رہی ہوں۔ کاریں باہر سڑک پر کس تیزی سے صبح کے چار بجے تک آجا رہی ہیں۔ یہ پیرس ہے اور میں لندن کی رہنے والی...... آخر کار جس کی ڈفلی اس کا راگ۔